Registered No. L. 4186

رجب ۱۳۵۸ھ

جلد ۱۵ - عدد ۱

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ’’ترجمان القرآن‘‘ - لاہور

پونچھ روڈ

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم، اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی ہیں۔

ضخامت ۴۰۴ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ۲؍۱۲۔ مجلد عہ۔ علاوہ محصول ڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"۔ لاہور

سرورق وتصاویر پین پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئے

فہرست مضامین

ماہ رجب ۵۸ھ - ستمبر ۳۹ء - جلد ۱۵ - عدد ۱

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں
طبع ہو کر دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ مبارک پارک سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

حدیث میں آیا ہے:

جاء رجل الی النبی صلعم فقال الرجل یقاتل للمغنم، والرجل یقاتل للذکر، والرجل یقاتل لیری مکانہ، فمن فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا کہ کوئی آدمی اسلیے لڑتا ہے کہ اسے مال ہاتھ آئے۔ کوئی اسلیے لڑتا ہے کہ اسکی ناموری ہو۔ کوئی اسلیے لڑتا ہے کہ اسکو ممتاز مرتبہ حاصل ہو۔ ان میں کس کی جنگ فی سبیل اللہ ہے؟ فرمایا فی سبیل اللہ تو صرف اسکی جنگ ہے

فی سبیل اللہ۔	جو اسلیے لڑے کہ خدا ہی کا کلمہ بلند ہو۔

دوسری حدیث میں ہے:

جاء رجل الی النبی صلعم فقال	ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ
یارسول ما القتال فی سبیل اللہ فان احدنا	یارسول اللہ! وہ کونسی لڑائی ہے جو اللہ کی راہ میں ہو؟ ہم میں سے کوئی
یقاتل غضبا و یقاتل حمیۃ؟ فرفع الیہ	تو جوش انتقام میں لڑتا ہے اور کوئی حمیت قومی کے جذبے سے۔ یہ سن کر آپ نے
راسہ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ	سر اٹھایا اور فرمایا جس نے جنگ اسلیے کی کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو بس
ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔	اسکی جنگ راہ خدا میں ہے۔

اس کے برعکس جو شخص انسانوں کا بول بالا کرنے کے لیے لڑے، اور اس لیے جنگ کرے کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اپنی اغراض کامیابی کے ساتھ پوری کریں، اسکے حق میں رسول خدا کا ارشاد ہے:

یجیئ الرجل اخذا بید الرجل فیقول	قیامت کے روز ایک آدمی دوسرے آدمی کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیگا اور خدا
ان ھذا قتلنی فیقول اللہ لم قتلتہ	سے عرض کریگا کہ اس نے مجھے قتل کیا تھا۔ خدا پوچھیگا تو نے اسے
فیقول لتکون العزۃ لفلان	کیوں قتل کیا؟ وہ کہیگا اسلیے کہ فلاں کی عزت اور برتری قائم ہو۔ خدا
فیقول انھا لیست لفلان	جواب دیگا کہ عزت اور برتری اس فلاں کا حق تو نہ تھی۔ پھر اس مقتول کے
فیبوء باثمہ	گناہوں کا بوجھ اس قاتل پر لاد دیا جائیگا۔

مقالات

اسلامی قانون اور نظام معاشرت

(۳)

ترجمہ مولوی ابو النصر محمد خالدی صاحب

(ماخوذ از "لیگیسی آف اسلام")

تعزیری قوانین اسلام کے تعزیری نظام کے متعلق زیادہ کہنا نہیں ہے۔ یہ انتقام کے ابتدائی تصور اور یہودی قانون کے "آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان" والے اصول پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی تعزیری قانون میں ہم کو بغیر کسی کمی کے وہی قدیم نظریات ملتے ہیں جو توریت میں مرقوم ہیں۔ ان تصورات کی قدر و قیمت تاریخی اور رواجی حیثیت سے ہے[1]۔ بعد کے فقہاء نے، باوجود اس کے کہ خود اہل عرب میں خیالات کی ترقی بہت کچھ ہوئی، قرآن کے الفاظ سے ہٹنے کی جرأت نہیں کی، البتہ وہ توجیہ و تاویل کے ذریعہ سے

[1] فاضل پروفیسر نے یہاں خالص علمی حیثیت سے اسلام کے تعزیری قانون پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بجائے ان متعصبانہ مفروضات پر تکیہ کر لیا ہے جو یورپ میں پہلے سے شائع و ذائع ہیں۔ زمانہ حال میں مغرب کے قانونی نظریات کا نشوونما جس ڈھنگ پر ہوا ہے اس کا تمام تر رجحان اس طرف ہے کہ سوسائٹی کے بجائے مجرم افراد کے ساتھ زیادہ ہمدردی، رحم اور شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ اس وجہ سے اہل مغرب کے نزدیک کسی قانون کے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کا معیار یہ قرار پا گیا ہے کہ وہ سوسائٹی کے امن کو غارت کرنے والے اور اجتماعی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے اور سوسائٹی میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے والے مجرمین کے ساتھ کس قدر نرمی برتتا ہے اور انہیں کتنی لمبی قسطوں میں عذاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۹ پر ملاحظہ کریں)

قرآنی احکام کو سختی کے ساتھ نافذ کرنے سے گریز کرنے لگے۔[۵۲]

بقیہ حاشیہ نمبر ۴۹ ۔ دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو شخص اسلامی قانون کو دیکھے گا، ظاہر ہے کہ اسکو وہ بدنی سزائیں بہت سخت معلوم ہونگی جو قرآن اور توراۃ میں تجویز کی گئی ہیں، کیونکہ وہ مغرب کے انفرادیت پرستانہ رجحان کے بالکل برعکس ایک دوسرے رجحان پر مبنی ہیں۔ اسلامی قانون کا رجحان اس طرف ہے کہ فرد کی بہ نسبت جماعت زیادہ ہمدردی اور رحم کی مستحق ہے۔ وہ فرد کے جسم کی بہ نسبت جماعت کے اخلاق اور اجتماعی زندگی کے امن کو زیادہ عزیز رکھتا ہے، اور اس کے نزدیک کسی قانون کے مہذب ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ حیات اجتماعی کے نظم کو انتشار اور بدنظمی پھیلانے والی قوتوں کی دراندازی سے کس حد تک محفوظ کرتا ہے۔ یہ دو مختلف قانونی رجحانات اور نظریات ہیں۔ ایک محقق عالم ان میں سے جسکو پسند کرے اسکی تائید میں اور جسے ناپسند کرے اسکی تردید میں دلائل پیش کر سکتا ہے۔ مگر یہ بات شان تحقیق سے بالکل گری ہوئی ہے کہ آدمی کسی قانونی نظریہ کی تردید کے بجے اسکی قدامت کو بطور دلیل پیش کرے، یا "عدل" کے تصور کو "انتقام" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ سمجھ لے کہ اس نے بس اپنی اس لفظی تعبیر ہی سے اسکی کافی تردید کر دی ہے۔ ترجمان القرآن

[۵۲] یہاں پروفیسر صاحب واقعات کے بجائے خود اپنے خیالات کا عکس پیش فرما رہے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک قرآن کے احکام غیر مہذب اور وحشیانہ ہیں، اور ان کا مفروضہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان احکام پر عمل نہ کرنا چاہیے تھا، اسلیے انہوں نے قرآنی تعزیرات کے نفاذ میں فقہائے اسلام کی احتیاط کو یہ معنی پہنا دیے کہ یہ فقہاء خود بھی ان احکام کو وحشیانہ سمجھتے تھے اور لفظاً ان پر ایمان لانے کے باوجود عملاً ان کو نافذ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ واقعات کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی یہ اچھی خاصی لطیف کوشش ہے۔ مگر شائد فاضل پروفیسر کی نگاہ اُس حدیث پر نہیں پڑی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کی پیٹھوں کو حدود سے بچاؤ جہاں تک ممکن ہو" اور یہ حدیث بھی شائد انہوں نے نہیں دیکھی کہ "ملزم کو بری کرنے میں امام کا غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے" اور شائد اُن احادیث سے بھی وہ واقف نہیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجرموں کے خود اقبال جرم کر لینے پر بھی انہیں سزا دینے

شریعت کا ترکہ | کیا وسیع ترین مفہوم میں بھی اسلام کے قانونی ترکے[1] کے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔؟

رائج الوقت رائے کے مطابق تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہی بے سود ہے کہ مشرقی و مغربی قانون کا کوئی نقطہ اتصال ہے، اسلیے کہ اعتقاد کے سخت دائرہ میں محدود رہ کر وہ ہمارے کلیات تک نزول نہیں کر سکتا۔ چونکہ وہ مذہبی قانون ہے لہذا ہمارے تخیلات سے مختلف ہے اور اس میں نشو و ارتقار کی بالکل صلاحیت نہیں۔ اس حیثیت سے دو نمایاں نقاط نظر کو عام طور پر گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ نصرانیت اور دوسرے ادیان کی طرح اسلام کے بھی چند خاص معتقدات ہیں جنہیں اس کے پیرو بحث و تمحیص کے لیے پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلامی قانون پر جامد ہونے کا الزام لگانا ایسا ہی نادرست ہوگا جیسا کہ نصرانیت پر اسی قسم کا الزام لگانا۔ ہر بڑے مذہبی نظام میں صرف اعتقادات ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ سینٹ طامس اکیوناس (S.. Thomas Aquinas) نے بالکل سچ کہا ہے کہ "قانون کے آخری مقصد یعنی رفاہ عامہ کے مآخذ، اشخاص حالات اور ادوار کے مطابق بہت مختلف ہوتے ہیں"۔ اسلامی مفکرین اس چیز کو بالکل واضح طور پر سمجھے ہوئے تھے۔ ارسطو کے سیاسی نظریات نے دین کے الہامی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ - میں کسقدر تامل فرماتے تھے۔ اور شائد انہوں نے اس بات پر بھی نظر نہیں فرمائی کہ قرآن اور حدیث کی رو سے جن اخلاقی و معاشرتی جرائم کی سزائیں سخت ہیں، انکے ثبوت کی شرائط بھی سخت رکھی گئی ہیں۔ اگر یہ سب باتیں بھی پروفیسر صاحب کی نظر میں ہوتیں تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ قرآن کے تعزیری احکام کو نافذ کرنے میں فقہائے اسلام نے جو احتیاطیں برتی ہیں وہ دراصل اسلامی قانون کی اسپرٹ اور عہد رسالت و عہد صحابہ کے عدالتی نظائر پر مبنی ہیں، نہ کہ ان تخیلات پر جنہیں بیسویں صدی میں ایک یورپین پروفیسر ہی کا دماغ جنم دے سکتا ہے۔ ترجمان القرآن

[1] "اسلام کے قانونی ترکہ" سے پروفیسر صاحب کی مراد وہ اثرات ہیں جو زمانۂ حال کے مغربی قوانین نے اسلام سے قبول کیے۔ ترجمان القرآن

اصول سے مل کر عربی علوم میں ایک ایسا نظام پیدا کیا جو عہد وسطی کے نصرانی سیاسی تخیلات سے ایک حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ یہ تشابہ قدرتی ہونے کے ساتھ نمایاں بھی ہے[۱]۔ اسی پر ہم مختصراً گفتگو کرینگے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، معاشرہ ایک حقیقت ہے، یہ کوئی پراگندہ انبوہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا اجتماع ہے جو مشترک مقصد کی وجہ سے قایم اور باہمی امداد کی بندشوں سے مربوط ہے۔ اس لیے مملکت کا معاشری اور اخلاقی تصور یہ قرار پاتا ہے کہ "حکومت کا مقصد دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے حصول میں مدد دینا ہے"۔ معاشرت ہی کے ڈھانچہ سے قانونی نظام متعین ہوتا ہے۔ اور درحقیقت قانون کا جواز بھی اسی لیے نکلتا ہے۔

قانون کے آغاز کی نشاندہی مسلمان بھی بالکل ویسی ہی کرتے ہیں جیسی کہ اس کے متعلق نصرانی نظریہ میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی تاریخی دور کی ابتداء میں ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب سارے انسان ایک امت تھے۔ برائیوں سے ناواقف ابتدائی انسان فطری قوانین کے احکام کے مطابق پر امن (نراج دانارکی) کی حالت میں تھا۔ قابیل کے جرم کے ساتھ ہی سنہری دور کا خاتمہ ہو گیا۔ انسان کے جذبات نے غلبہ حاصل کر کے معاشری پراگندگی پیدا کی جس سے حقیقی دین کو نقصان پہنچا اور مخصوص قوانین جاری کیے گئے۔

---

[۱] یہ صحیح ہے کہ دور متوسط کے مسلمانوں نے یونان اور روم و عجم کے اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ افکار و نظریات کا جوڑ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ملا کر ایک ایسا نظام بنا لیا تھا جسے خالص اسلامی نظام کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ مسلمانوں کا فعل تھا نہ کہ اسلام کا۔ اسلام نے کسی ارسطو اور کسی افلاطون سے کچھ نہیں لیا۔ وہ خود اپنے مستقل نظریات اور اصول رکھتا ہے، اور جب اسلام کے عنوان پر کوئی بحث کی جائے تو صحیح یہ ہے کہ تمام تر گفتگو قرآن اور سیرت رسول اللہ، یا حد سے حد خلفاء راشدین کے طریقہ تک محدود رہے۔ لیکن مغربی مصنفین عموماً یہ غلطی کرتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک چیز قرار دے لیتے ہیں، اور اسلام کا عنوان دے کر ایک ہی مضمون میں قرآن و سنت اور مسلمان مفکرین کے خیالات اور مسلمان سلاطین و اہل سیاست کے افعال

قانون کا مقصد برائی کو روکنا ہے۔ اس سے دو اصول نکلتے ہیں: مساوات اور تقویٰ۔

۱۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ عربی کو عجمی پر، اپنے خالق کے سامنے سب انسان مساوی ہیں"۔ چونکہ سب مسلمان اللہ کے آگے مساوی درجہ رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت ایک ایسے خاندان کے ارکان کی ہے جس میں کوئی شریف ہے نہ رذیل بلکہ سب کے سب مسلمان ہیں اس لیے وہ کشوری قانون کے آگے بھی مساوی المرتبت ہیں۔ اس مساوات کا اعلان ایسے زمانے میں کیا گیا جب کہ تمام مسیحی معاشرہ اس سے عملاً ناواقف تھا۔

۲۔ سب کے لیے مساوی حیثیت رکھنے والے اس قانون کی بنیاد لازماً تقویٰ پر ہے۔ ہر مسلمان کو اپنا عہد پورا کرنا چاہیے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے مال سے بغیر اس کی منظوری کے استفادہ نہیں کرسکتا۔ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے لہٰذا وہ اس پر نہ تو ظلم کرے اور نہ اسکی بے عزتی کرے"۔ "جس شخص نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی اور چیز پر دست درازی کی ہو اسے چاہیے کہ اس سے معاف کرائے"۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی حدیثیں اسلامی قانون کے عام اصول ہیں۔ تقویٰ کا تصور دراصل اخلاقی ہے جس کو اسلام میں ایک عالمگیر مسلک اور اجتماعی طریق عمل کے درجہ تک ترقی دی گئی ہے۔ یہ بات ہم کو متأثر کرتی ہے، کیونکہ دیانت و راستبازی کے اُس جرمانی اور جاگیرداری تصور کی بہ نسبت، جو کہ شخصی وفاداری کے ساتھ وابستہ تھا، یہ اسلامی تصور پرہیزگاری ہمارے ضمیر سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون انسان کی نیت کو اسکے تمام اعمال کی بنا قرار دیتا ہے۔ اسکی نگاہ میں اصلی اہمیت ظاہری افعال یا الفاظ کی نہیں بلکہ نیت اور ارادہ کی ہے۔ نیت اور ارادے کا اظہار خواہ کسی طرح ہو، وہ قانونی حدود پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسلامی قانون میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی حکم محض فعل کی ظاہری صورت پر یا محض الفاظ پر لگا دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں ذرا جرمانی ضابطہ کی اُن رسمی تفصیلات پر ایک نظر ڈالیے جن کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی قانون کے ماہرین نے ایک بڑا اہم اصول جو طے کیا ہے وہ یہ ہے کہ اجماع بھی قانون کے ماخذ میں سے ایک ماخذ ہے یعنی یہ کہ جو بات ایک دفعہ امت میں بالاتفاق طے ہو چکی وہ اب قانون ہے افراد کو اس سے انحراف کا حق نہیں رہا۔

چونکہ معاشری سود بہبود ہی اسلامی قانون کے مدنظر ہے اس لیے وہ بالکل ہمارے ہی قانون کی طرح لازمی طور پر ترقی کرنے والا قانون ہے۔ وہ قابل تغیر ہے اور حالات و ضروریات کے ساتھ بدلتا ہے فقہ کے بڑے بڑے مذاہب کا اس نقطہ پر اتفاق ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ "قانونی احکام ناقابلِ تبدیلی نہیں ہیں کیونکہ وہ منطق یا نحو کے قاعدے نہیں ہیں۔ جو کچھ واقع ہوتا ہے یہ اس کا اظہار کرتے اور ان حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں جو واقعات سے پیدا ہوں"۔ عرب اس لچک کے سبب کو نہایت واضح طور پر دیکھ چکے تھے۔ معاشرے زندہ نظام ہوتے ہیں اور اپنے دوران حیات میں مسلسل تبدیلیوں سے گذرتے رہتے ہیں "حضرت آدم کے زمانے میں انسان کی حالت کمزور اور پر آلام تھی۔ اللہ کا رحم بہت سے دوسرے معاملات تک وسیع تھا۔ جب معاشرہ زیادہ وسیع اور مختلف الھیئت ہو گیا تو قوانین میں اضافہ ہوا"۔ زندگی کا یہ تسلسل پوری اسلامی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر (صلعم) کے صحابہ کسی حکم کی غیر موجودگی میں مصلحت کی بناء پر مختلف فیصلوں پر پہنچتے تھے۔ مثلاً انہوں نے فیصلہ کیا کہ قرآن کو لکھ لینا چاہیے اگرچہ ان کو ایسا کرنے کا اختیار کسی حکم یا قول کی بناء پر نہیں تھا۔ حکومت کی مختلف شاخوں کے لیے انھوں نے دفاتر قائم کیے، سکتے ڈھالے اور بندی خانے بنائے مصلحت ہی کی بناء پر شریعت قانونی گواہوں کی شہادت ان سخت شرائط کے تحت تسلیم کرتی ہے جن کا ذکر احادیث میں موجود نہیں ہے ...... یہاں تک کہ ضرورتاً اس نے بعض معاہدوں مثلاً قرضوں کی تعبیر نہایت وسیع کی ہے ......"

یہ ہیں اس اقتدار کی بنیادیں جو مسلمان مقننوں نے رواج کو دیا ہے۔ یہ ایک قسم کا غیر مکتوب

قاعدہ ہے جو قانون وضع کرنے بلکہ اس میں ترمیم کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے "وہ جس کو مومن پسند کرتا ہے اس کو اللہ بھی پسند کرتا ہے"۔ جب کوئی رواج باقاعدہ ہو، مستحکم ہو، اور تقویٰ یا شریعت کے عام اصول کے خلاف نہ ہو تو پھر عمل درآمد کو بھی قانون ہی کا سا اقتدار حاصل ہوتا ہے اور وہ شریعت ہی کا لازمی جزو ہو جاتا ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ "ضرورت نے بہت سی ایسی چیزوں کو جائز کر دیا ہے جو سخت اصول کے اعتبار سے جائز ہونے کے لائق نہیں تھیں"۔ مثلاً مقروض کی حالت درست رکھنے کے لیے رہن جائز ہے۔ نظری طور پر قرضہ پر منافع لینے کی ممانعت ہے کیونکہ اکثر ابتدائی معیشتوں کی طرح یہ سرعت سے نامناسب سود تک پہنچ جاتا ہے[1] اور ابتدائی معمولی منافع ہی بڑھ کر اپنے حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم دوامی پٹے اور مزدور کو پیداوار کا کچھ حصہ بطور اجرت دینے اور دلال یا منادی کرنے والے سے معاہدہ کرنے ...... کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ تمام معاہدات شرعی اصول کی رو سے اپنے منشاء کے غیر یقینی ہونے اور رہن میں خطرے کا عنصر موجود ہونیکی وجہ سے باطل و کالعدم قرار پانے چاہئیں۔ لیکن بایں ہمہ اہلِ سنت وجماعت کے دو فقہی مذہب انکو جائز تسلیم کرتے ہیں۔

قانون صرف عمل درآمد ہی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ تبدیلیوں کا بھی ساتھ دیتا ہے "یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ ہر وہ قانون جسکی بنیاد عمل درآمد یا رواج پر ہو رواج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے ...... ایک طرف تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ قائم ہو چکا ہے ہم کو اسکی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ ہم قانون وضع نہیں کر سکتے، قانون وضع کرنے کے لیے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ ہم کو حاصل نہیں

---

[1] سود میں مناسب اور غیر مناسب حد کا تخیل غیر اسلامی ہے۔ نیز یہ خیال کہ "ابتدائی" معیشتوں میں سود کی نوعیت کچھ اور تھی، اور موجودہ دور کی "انتہائی" معیشتوں میں کچھ اور ہے، یہ بھی کسی علمی حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض ایک وہم ہے۔ سود کی معاشی حیثیت اور اسکی اجتماعی مضرت جو پہلے تھی وہی آج بھی ہے۔ ترجمان القرآن

ہے۔ جو مسائل ہمارے روبرو پیش کیے جاتے ہیں ان کا حل ہم کو ان ہی اصول کے مطابق کرنا پڑتا ہے جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ مگر دوسری طرف کسی ایسے قانون کو استعمال کرنا جسکی بنیاد قدیم رواج پر تھی لیکن جواب بدل چکا ہے رائے عامہ کے خلاف جانا اور مذہب سے اپنی ناواقفیت ثابت کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی قاعدہ کسی خاص زمانے کے حالات کے لیے بنایا گیا ہو تو ان حالات کے بدلنے کے ساتھ وہ قاعدہ بھی بدل جائیگا جن کے تحت وہ بنایا گیا تھا۔"

اس ارتقاء کا منبع حاکم یا امیر ہے۔ اس کی حیثیت ایک وکیل کی ہے۔ وہ اپنے اقتدار کو شرعی احکام کی جگہ تو استعمال نہیں کرسکتا البتہ وہ مسلّمہ مذاہب میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکتا ہے۔ وہ کسی رواج کو اس قدر عام کرسکتا ہے کہ بالآخر وہ قانون بن جائے۔ سب سے آخر یہ کہ ضرورت کے وقت حالات کے اعتبار سے وہ اپنے اختیار تمیزی کو بھی استعمال کرسکتا ہے جیسا کہ ہر ایک اچھے امین کو اپنے امانت دہندہ کی طرف سے کرنا چاہیے۔

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی قانون کے ارتقاء میں مذہبی تخیل کا کوئی حصہ نہیں؟ ایسا کہنا اس زبردست اتحاد خیال کا غلط تصور پیش کرنا ہے جو اسلام کی خاص قوت ہے۔ علم فقہ مذہبیات کا ایک حصہ ہے۔ شاید نصرانیت سے بھی زیادہ خلافت نے قدیم شہری مملکت کے تخیل کو محو کر دیا۔ لیکن اس توجیہ میں ہم کو بے راہ نہ ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تقننوں کا مفہوم نصرانیوں کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا فرق سرکاری قانون اور خانگی قانون کے فرق سے زیادہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مذہبی تخیل کا بہت زیادہ اثر ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ بہ نظر اول کسی شخص کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ اثر اُس اخلاقی رجحان میں موجود ہے جو مذہب نے قانون میں پیدا کر دیا ہے مطلب یہ کہ یہ چیز شرعی احکام اور اخلاقی اصول کے باہمی تعلق میں مضمر ہے جو اکثر ایک دوسرے سے بالکل گھُل

مل جاتے ہیں۔ شرکت، قرض، گواہوں کی اہلیت، آقا اور غلام کا باہمی تعلق، مدعی و مدعا علیہ، معاً اور معاملہ غرض ہر وہ چیز جس کا موضوع قانونی تعلقات ہوں، اسلام میں اخلاقی شکل اختیار کر لیتی ہے، اور اس کی حیثیت ایک مجرّد خانگی معاملے سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً امانت، باہمی امداد و اعانت کی ایک شکل ہے اس لیے کہ اس طریقے سے ایک شخص مالک جائداد کو اس کی جائداد محفوظ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس حد تک یہ معاملہ خانگی ہے، مگر اسلام میں ایسا کرنے کی اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ اللہ فرماتا ہے "نیک کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو"۔ اور رسول اللہ (صلعم) فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف رہتا ہے اللہ بھی اس کی حاجت روائی کرتا رہتا ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر ایسی چیز لیتا ہے جو اس کے لیے واجب الوصول نہیں تھی تو ایسا شخص اپنے سر دوگونہ ذمہ داری لیتا ہے۔ وہ صرف اس شخص ہی کا گنہگار نہیں ہوتا جسے اس نے دھوکا دیا، بلکہ ساتھ ہی اللہ کا بھی گناہ گار ہوتا ہے۔ جو قرض دار باوجود قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ادا کرنے میں لیت و لعل کرتا ہے وہ ایک سخت گناہ کا ارتکاب کرتا اور اپنی نجات کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ پیغمبر (صلعم) نے پڑوسی کے تعلقات کے سلسلے میں بڑے ہی دلکش انداز میں فرمایا ہے کہ "تم کو معلوم ہے کہ ہمسایہ کا حق کیا ہے؟ اس کا حق یہ ہے کہ اگر تم سے مدد چاہے تو اس کی مدد کرو، اور قرض مانگے تو قرض دو، اور اگر تم سے اس کا کوئی کام پڑے تو پورا کرو، اور بیمار ہو تو عیادت کرو، اور مر جائے تو جنازہ کے ہمراہ جاؤ، اور اس کو کچھ بہتری حاصل ہو تو مبارک باد دو، اور مصیبت پڑے تو تعزیت کرو، اور بغیر اس کی اجازت کے اپنی عمارت اونچی نہ کرو کہ اس کی ہوا رکے، اور اگر کوئی میوہ خریدو تو اس کو ہدیہ دو ورنہ چھپا کر اپنے گھر لاؤ، اور اپنے بچے کو میوہ لے کر باہر جانے نہ دو کہ اس کے بچے کو رنج نہ ہو، اور اپنی ہانڈی اور بگھار کی خوشبو سے اسکو ایذا نہ دو ورنہ اس کے ہاں بھی ایک چمچہ بھیجو۔"

اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ حق کا استعمال حقیقتاً ایک فرض کی ادائی سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر حق میں نیکی ہے تو اس کو "بغیر گناہ کے ترک کرنا" ناممکن ہے۔ جو شخص غاصب سے مال مغصوبہ حاصل کرتا ہے وہ ایک اخلاقی فریضہ بھی انجام دیتا ہے اس لیے کہ اگر وہ خاموش رہے تو گویا اس نے ظالم کو اپنا ظلم جاری رکھنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا پیغمبر (صلعم) نے فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ صحابہ نے کہا کہ مظلوم کی مدد تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ پیغمبر (صلعم) نے جواب دیا "اس کا ہاتھ پکڑ لو" (یعنی ظلم سے روک دو)۔ اس طرح ہر شخص کا حق صرف اس کا خانگی معاملہ نہیں بلکہ اخلاقی فریضہ بھی ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی اخلاقی قانون اور معاشری اغراض اس حق کی چند حدود متعین کر دیتے ہیں۔ مصالحت اور سمجھوتہ کر لینے کو بہر حال مستحسن مانا جاتا ہے۔ تاوان کی ممانعت ہے۔ قرض دار کے خلاف تکلیف دہ کارروائی شریعت کے خلاف ہونے کے علاوہ حق کا بیجا استعمال بھی ہے۔ "کوئی شخص اپنے حق کو اس طرح استعمال نہ کرے جس سے دوسرے کو صریح نقصان پہنچے"۔ ان معاملات میں اسلامی مقننوں کا احساس ہماری توقع سے زیادہ نازک واقع ہوا ہے۔ مثلاً جس شخص کے خلاف قانونی کارروائی کرنا مقصود ہو اسکے مخالف کو ایسی کارروائی کا مختار نہیں بنایا جاتا۔ اسی طرح جوان لونڈی کو بدکار کے ہاتھ فروخت نہیں کیا جاسکتا کہ مبادا وہ لونڈی کو حرام کی ترغیب دے یا اس کو بداخلاق بنا دے۔ قانون کی حدود اور اس کی تجاویز ہر موقع پر اخلاقیات کے معیار پر جانچی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بالکل ٹھیک کہا گیا ہے کہ "انسان کا کوئی حق ایسا نہیں ہے جس میں خدا کا حصہ نہ ہو"۔ خدا کا حصہ اسکا یہ حکم ہے کہ ہر ایک کو اس کا جائز حصہ دو اور دوسرے کے حق میں مداخلت نہ کرو۔ اس طرح اب ہم مجرد حق کے نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جو تمام متمدن ملتوں کا مشترک حصہ ہے۔

اسلامی قانون کا نظام اپنی داخلی خصوصیات کے لحاظ سے یہی ہے۔ ماہرین کی نظروں میں وہ تحسین و تعریف کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اپنے ہم عصر ابتدائی جاگیری قوانین کے

بے ڈھنگے رسوم اور وحشیانہ رواجوں پر وہ بے حد فضیلت رکھتا ہے۔

اسلامی قانون میں ایک چیز کی کمی ہے جو اس کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے، یعنی ایک زیادہ تحلیلی رجحان۔ انفرادی خود مختاری کا رجحان اور تنظیم و اطاعت کی بنیادی عدم صلاحیت، عربوں کی سیاسی نااہلیت کے اسباب ہیں اور ان کے قانونی نظام میں اخلاقی لحاظ سے یہی چیزیں کمزوری کا منبع تھیں[1]۔ اس کے ضعف کا دوسرا سبب یہ ہے کہ عربوں نے اپنے نظام کے بنیادی اصول میں بہت مبالغہ کیا ہے۔ انھوں نے اس تصور کو کہ انصاف عوض معاوضہ[2] کے اصول پر مشتمل ہے انتہائی حدود تک بڑھا دیا اور یہی حال یورپ کے دینی مقننوں کا ہے۔ یہ صورت حال ارسطو کے فلسفہ کی بھی کم سے کم اتنی ہی مرہون منت ہے جتنی کہ مذہبی عقیدوں کی۔ ہر حالت میں سود کی ممانعت، ہر قسم کے خطروں سے پرہیز، معاہدوں میں ہر قسم کی غیر یقینی چیزوں کو روکنا، مختصر یہ کہ اسلامی قانون کی تمام خصوصیات اسی اصول سے نکلتی اور اسی عام تصور پر منحصر ہیں کہ جن معاملات میں سود یا قمار یا غیر یقینیت کا عنصر شامل ہوتا ہے، ان میں فریقین کے درمیان منافع کے مساویانہ مبادلہ کا اصول ٹوٹ

[1] مصنف جس چیز کو عیب بتا رہا ہے وہی اصل اسلامی قانون اور نظام معاشرت کا حسن ہے۔ مصنف اُس ملک کا رہنے والا ہے جس میں شخصیت کو اجتماعیت کے اندر گم کر دینے والا نظام تمدن (یعنی فاشزم) برسر عروج ہے۔ لہٰذا اسکی نگاہ میں یہ بات کھٹکنی ہی چاہیے کہ اسلام ہر ہر فرد کے اخلاقی، تمدنی اور معاشی حقوق کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان جسقدر صحیح توازن اسلام نے قائم کیا ہے وہ کسی دوسرے نظام تمدن کو نصیب نہیں۔ یہاں نہ فاشزم کی طرح فرد کو جماعت میں گم کیا جاتا ہے، اور نہ مغربی ڈیماکریسی کیطرح فرد کو جماعت پر چھا جانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن

[2] اجتماعی زندگی میں منصفانہ تعاون کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے جو کچھ لے اسکے مقابلہ میں کوئی ہم وزن یا ہم قدر چیز اس کو دے۔ مصنف اس قاعدۂ کلیہ کے ہمہ گیر اطلاق کو نارو ا مبالغہ قرار دیتا ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی انصاف اس کو بھی قرار دیا جائے کہ آدمی لے تو لے مگر دے کچھ نہیں!۔ ترجمان القرآن

جاتا ہے اس لیے ساتھ ہی انصاف بھی مارا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن کے پیش نظر ہمیشہ صرف توازن کو برقرار رکھنا ہوتا ہے یعنی ہر ایسی تجویز کی روک تھام جو اس اصول کے انطباق میں تکلیف پیدا کرے۔ مساوات ایسی ہونی چاہیے جس سے اعتدال کا مقصد فوت نہ ہو۔ یورپ میں قانون کلیسا کے ماہرین بھی یہی کہا کرتے تھے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جو مسلسل جدوجہد کی گئی اسکی وجہ سے قواعد و ضوابط میں زیادتی ہوئی، یعنی جزئیات کو منضبط کرنے کا رجحان جو ہر قسم کے کاروبار کو معطل کر دیتا اگر احکام کو کم و بیش ظاہری امکانی مفروضوں کے نظام سے نہ بچایا جاتا، یا اگر اسکا زیادہ حصہ خالص نظریاتی نہ رہتا۔

عربی قانون سے جو چیزیں اہل یورپ نے قطعی طور پر لی ہیں ان میں بعض تو قانونی ادارے ہیں جیسے محدود شرکت، اور بعض تجارتی قانون کی اصطلاحیں ہیں۔ لیکن اگر ان کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی قانون کے بعض اعلیٰ معیاری اجزا نے موجودہ یورپین تصورات کے نشو و ارتقاء میں مفید حصہ لیا ہے اور یہیں سے اسکی مستقل فضیلت کا پتہ لگتا ہے۔

بچوں کیلیے مفید کتابیں

رسالہ دینیات :- تصنیف سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب آپ کو اردو زبان میں نہیں مل سکتی۔ قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر

سراپائے رسولؐ :- اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و خصائل، لباس، معاشرت اخلاق اور آداب، اطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں۔ قیمت ۸ر محصول ڈاک ۱ر

ہمارے نبیؐ کے صحابہ :- اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دل نشیں انداز بیان کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر محصول ڈاک ۱ر

ملنے کا پتہ :- دفتر رسالہ ترجمان القرآن - لاہور

دلائل السنن و الآثار

(۸)

از جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی

درایت احادیث کی صحت کو جانچنے اور احادیث کی صحیح پیروی کرنے کے لیے روایت کے ساتھ درایت بھی ضروری ہے۔ لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم ایک عام غلط فہمی کو دور کر دینا چاہتے ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ درایت سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص حدیث کے مضمون کو اپنی عقل کے معیار پر جانچے، اور جس حدیث میں کوئی بات اسے اپنی عقل کے خلاف نظر آئے اسے بے تکلف رد کر دے۔ درایت کا یہ مفہوم بالکل غلط ہے۔ ہر معاملہ میں ہر شخص کی عقل کو معیار ماننا بالکل مضحکہ خیز بات ہے۔ جن لوگوں نے عقلی تحقیقات میں عمریں گنوادیں وہ بھی کسی ایک عقلی نظریہ پر متفق نہ ہو سکے۔ فیثاغورس نے ایک زمانہ میں زور تقریر اور قوت استدلال سے تمام دنیا کو نظام شمسی کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے بعد بطلیموس آیا تو اس نے اس کے تمام نظام کو الٹ پلٹ کر دیا اور اپنی بات منوالی۔ اب یورپ نے بطلیموس کے تمام خیالات کو باطل کر دیا اور فیثاغورس کے نظام کو حق سمجھ کر قبول کر لیا۔ تو کیا اس عقل کو جو خود ایک بات پر نہیں جمتی اور نہیں جم سکتی، جملہ امور میں معیار حق قرار دیا جا سکتا ہے؟ کل جب دنیا میں بطلیموسی نظام کو محکم سمجھا جاتا تھا، بہت سے لوگ حدیث اور قرآن میں اس نظام کے خلاف کوئی بات دیکھ کر پکار اٹھتے تھے کہ یہ تو خلافِ عقل ہے۔ مگر علم کی ترقی نے بالآخر ثابت کر دیا کہ وہ ان کا قصورِ عقل تھا۔ اسی طرح آج جو لوگ اپنے زمانہ کے نظریات

کی بناپر قرآن و حدیث کی بعض چیزوں کو خلاف عقل قرار دینے کی جرأت کرتے ہیں، ان کا قصور عقل ابھی آگے
چل کر خود واضح ہو جائیگا- یہ تو ہماری عقل کا حال عالم شہادت کے معاملات میں ہے- پھر بھلا امور غیب
میں اسے کس طرح آخری حکم بنایا جا سکتا ہے- اسی لیے حکمار اسلام فرماتے ہیں کہ "بلاشبہ عقل ایک میزان
صحیح ہے اور اسکے احکام یقینی ہیں، لیکن یہ کہ اس میں توحید اور آخرت کے امور اور نبوت کی حقیقت اور
صفات الٰہیہ کو تولا جائے، محالات کی آرزو کرنا ہے" (العقل و النقل) مشہور مورخ علامہ ابن خلدون
نے کہا ہے کہ "یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں تمام موجودات اسی میں منحصر ہے بلکہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں کہ
اب تک ہم پر منکشف نہیں ہوئیں" اسی بناپر امام ربانی مجدد الف ثانی کو بھی اپنے مکتوبات میں لکھنا پڑا کہ

طور عقل ورا و طور حس است کہ انچہ بہ حس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہم چنیں طور
نبوت ورا و طور عقل است، انچہ بہ عقل مدرک نشود بہ توسل نبوت درک می آید- ہر کو را و طور
عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوت و مصادم بداہت است"

یعنی عقل کی راہ .... حواس کی راہ سے جدا ہے- جو چیز حواس سے محسوس نہیں ہوتی وہ عقل
سے معلوم ہو سکتی ہے- اس طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستہ سے علیحدہ ہے یعنی جس بات کو عقل سے
دریافت نہیں کر سکتے اس کو نبوت کے توسط سے جان سکتے ہیں اور جو شخص عقل کے اوپر کوئی اور طریقہ
علم کا تسلیم نہیں کرتا وہ درحقیقت نبوت کا منکر اور بداہت کا مخالف ہے[۱]"

غور کا مقام ہے کہ جب خود عقل ہی سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں ہماری عقل
کی رسائی سے بالاتر ہیں تو یہ سعی لاحاصل کرنا کہ ہر شئی کو عقل ہی سے سمجھا جائے حقائق کا انکار کرنا ہے
عقل اس کا نام نہیں ہے کہ ہر چیز میں ہر شخص بلا سمجھے بوجھے مداخلت شروع کر دے اور جسکا جو دل چاہے
کہنے لگے، بلکہ عقل کا مقصد یہ ہے کہ جس علم یا جس فن میں کسی کو کمال حاصل ہو اسکی بات اس علم کے متعلق

[۱] العقل و النقل،

قبول کی جائے۔ بعض احادیث صحیحہ جو بظاہر عقل انسانی پر منطبق نہیں ہوتیں ان کی دو ہی وجہیں سمجھ میں آتی ہیں (۱) نقصان نقل (۲) نقصان عقل۔ نقصان نقل یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جائے وہ دیگر تاریخی بیانات کے مخالف ہو یا کسی دوسری صحیح تر سند سے اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت ہو جو اسکی تکذیب کرتی ہو، یا راوی سے مطلب سمجھنے میں کوئی غلطی ہوئی ہو، یا راوی نے کوئی ادھوری بات نقل کردی ہو، یا اسلام کے کسی مسلم اصول کے خلاف ہو، یا صریح نص قرآنی کے معارض ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اور نقصان عقل یہ ہے کہ بات بجائے خود صحیح ہو مگر ہماری عقل اسے پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہو، یا ہمارے علم نے ابھی اتنی ترقی نہ کی ہو کہ اسکی کنہ تک پہنچ سکیں۔ پہلی صورت میں کافی تحقیق کے بعد حدیث کو رد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں حدیث پر مخالفانہ کلام سے پرہیز کرنا واجب ہے۔

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اسلام نے عقل کا جسقدر لحاظ رکھا ہے شاید ہی کسی مذہب نے اس کا اتنا احترام کیا ہو۔ اسلام کا تو اپیل ہی تمام تر انسان کی عقل سلیم سے ہے۔ وہ بار بار انسان کو مشاہدہ اور غور و فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے، اور اپنے احکام کی تعمیل کے لیے بھی سمجھ بوجھ کو ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن پڑھو، اس کے صفحات اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ، یَتَفَكَّرُوْنَ، یَتَذَكَّرُوْنَ، یَنْظُرُوْنَ وغیرہ الفاظ سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عقل کی دنیا تنگ اور اسکی پرواز محدود ہے۔ عالم شہادت کی چیزوں کو تو عقل تھوڑا یا بہت جان سکتی ہے، مگر عالم ملکوت کی اشیاء اسکی بساط سے خارج ہیں۔ مابعد الطبیعیات کی گتھیوں میں سے آج تک کسی گتھی کو بھی انسان اپنی عقل سے نہیں سلجھا سکا۔ لہٰذا انسان کے لیے عقلمندی یہی ہے کہ وہ اپنی عقل کی حدود کو پہچانے، اور جو چیزیں اسکے فہم و ادراک سے ماوراء ہوں ان میں ایسے قطعی احکام لگانے سے پرہیز کرے کہ "فلاں بات عقل کے خلاف ہے لہٰذا غلط ہے" اور "فلاں بات میری سمجھ میں نہیں آتی لہٰذا اسکی کوئی حقیقت نہیں"۔ اسی لیے قرآن مجید نصیحت کرتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہیں اسکے پیچھے نہ پڑو۔

تعریف درایت | اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ احادیث میں جو مابعد الطبیعی مسائل (یا بالفاظ دیگر جو امور غیب) بیان ہوئے ہیں ان کو اپنی محدود عقل سے جانچنا اور محض عقلی فیصلہ کی بنا پر قوی سے قوی سند رکھنے والی حدیثوں کو غلط کہدینا، درایت نہیں ہے، اور لفظ درایت کا یہ غلط مفہوم جو آج کل عموماً دماغوں میں پیدا ہوگیا ہے، محض جہالت کا نتیجہ ہے۔

اصل میں درایت کے معنی ہیں سمجھ بوجھ کے۔ د ر ی ا ی ل ر ی د ر ا یۃً لغت میں جاننے، سمجھنے اور واقف ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآن میں بھی یہ لفظ جگہ جگہ اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ مثلاً اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ اور فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ وَمَا اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ وغیرہ۔ پس کسی بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور ظاہری مواد کے اندر حقیقت کو ٹٹولنا درایت ہے۔ آپ کے سامنے جب کوئی شخص آکر بیان کرتا ہے کہ فلاں جگہ ایسا واقعہ پیش آیا ہے تو اس روایت کو سن کر آپ کا ذہن دو طرح پر کام کرتا ہے۔ پہلے آپ دیکھتے ہیں کہ یہ اطلاع دینے والا قابل اعتبار بھی ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس نے خود اس واقعہ کو دیکھا ہے یا دوسروں سے سنا ہے، اور اگر دوسروں سے سنا ہے تو آیا وہ راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں، اور روایت کا یہ سلسلہ کسی معتبر عینی شاہد تک پہنچتا ہے یا نہیں۔ یہ جستجو اور تحقیق کا ایک سلسلہ ہے جس کو مجموعی طور پر آپ تحقیقِ روایت کا نام دے سکتے ہیں۔ اسکے بعد آپ کا ذہن دوسری طرح پر کام شروع کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ واقعہ بجائے خود کس نوعیت کا ہے معمولی ہے یا غیر معمولی۔ اگر غیر معمولی ہے تو آیا شہادت اتنی وزنی ہے کہ ایسی شہادت پر ایسے ایک غیر معمولی واقعہ کو تسلیم کرلیا جائے۔ پھر اس سلسلہ میں جو دوسری مستند معلومات میرے پاس موجود ہیں، یہ واقعہ ان کے خلاف ہے یا موافق۔ اور یہ کہ جن حالات میں اس واقعہ کا صدور بیان کیا جاتا ہے ان میں یہ پیش بھی آسکتا تھا یا نہیں۔ اس دوسری

قسم کی تحقیقات کا نام درایت ہے ۔ عدالت میں ہر جج، ہر مقدمہ میں تحقیق کے ان دونوں طریقوں کو استعمال کرتا ہے ۔ وہ گواہوں کے بیانات کو پہلے قانون شہادت کی کسوٹی پر پرکھتا ہے ۔ پھر انکی گواہی پر خود اپنی درایت کو استعمال کرکے رائے قائم کرتا ہے کہ جو اطلاع انکے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے وہ کس پایہ کی ہے، کہاں تک قابلِ قبول ہے اور اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں۔

حدیث میں بھی درایت کے استعمال کی نوعیت یہی کچھ ہے ۔ جس طرح شہادت کو جانچنا اور رائے قائم کرنا ہر راہ چلتے کا کام نہیں ہے، بلکہ اسکے لیے ایک ماہر فن جج کا علم اور تجربہ درکار ہے، اسی طرح احادیث میں بھی درایت سے کام لینا کالج کے ہر صاحبزادے کا کام نہیں ہے، بلکہ اس کا اہل صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے پوری واقفیت ہو، اس بارے میں جتنی روایات صحیحہ ہیں وہ اس کے پیش نظر ہوں، آنحضرت صلعم کے زمانہ کے واقعات اور حالات پر عبور رکھتا ہو، قرآن سے خوب واقف ہو، دین کے نظام کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہو، اور جس نے مدۃ العمر کے مطالعہ، غور و خوض اور تحقیق و تفتیش سے اتنی بصیرت بہم پہنچائی ہو کہ کسی حدیث کو سن کر اسکی سند پر نظر کیے بغیر وہ ایک حد تک وثوق کے ساتھ کہہ سکے کہ یہ حدیث آنحضرت کی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ملا علی قاری موضوعات کبیر میں لکھتے ہیں:-

وقد سئل ابن قيم الجوزيه هل يمكن معرفة الحديث الموضوع بضابط من غير ان ينظر في سنده فقال هذا سوال عظيم القدر وانما يعرف ذلك من تطلع في معرفة السنن الصحيحة وخلطت بلحمه ودمه وصار له

ابن قیم جوزی سے پوچھا گیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حدیث موضوع کو سند پر نظر کیے بغیر پہچان لیا جائے، یعنی کیا سند کے سوا موضوع حدیث کو جانچنے کے لیے کوئی اور کسوٹی بھی ہے؟ ابن قیم نے جواب دیا یہ بڑا اہم سوال ہے۔ یہ پہچان صرف اس شخص کو ہو سکتی ہے جس نے احادیث کی چھان بین میں ایک عمر گذار دی ہو حتی کہ حدیث کا علم

فيها ملكة واختصاص شديد بمعرفة السنن والآثار ومعرفة سيرة الرسول عليه الصلوة والسلام وهديه فيما يامر به وينهى عنه ويخبر عنه ويدعوا اليه ويحبه ويكرهه ويشرعه للامة بحيث كانه مخالطه عليه الصلوة والسلام بين اصحابه الكرام فمثل هذا يعرف من احواله وهديه وكلامه واقواله وافعاله

اس کے خون اور گوشت میں اتر گیا ہو اور اس علم میں اسے خاص ملکہ حاصل ہو گیا ہو، اور اس نے سیرت نبوی اور سنن و آثار سے گہری واقفیت بہم پہنچائی ہو اور وہ آپ کی ہدایت کو خوب جان گیا ہو کہ آپ کس چیز کا حکم دیتے تھے اور کس سے منع کرتے تھے، کس بات کی خبر دیتے تھے اور کس چیز کی طرف دعوت دیتے تھے، کیا بات آپکو پسند تھی، کس بات کو آپ برا سمجھتے تھے، اور کن طریقوں کو اپنی امت کے لیے مقرر فرماتے تھے۔ جب کوئی شخص ان امور کو جاننے میں اس حد کو پہنچ جائے کہ گویا وہ حضور کے ساتھ آپ کے مصاحبوں میں شامل ہے تو وہ بلا سند پہچان لیگا کہ کیا چیز آپ کے احوال اور آپ کی ہدایت سے تعلق رکھتی ہے، اور کونسا کلام آپ کا ہے، اور کس قول یا فعل کی نسبت آپکی طرف ہو سکتی ہے[۱]۔

حضرت امام شافعی کا یہ قول بھی اسی معنی میں ہے کہ "جس نے حدیث میں نظر پیدا کر لی اس کی حجت قوی ہو گئی"[۲]

صاحب مفتاح السعادۃ درایت کی تعریف میں رقمطراز ہیں، هو علم يبحث فيه عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث وعن المعنى المراد منها مبنيا على قواعد العربية وضوابط الشريعة مطابقا لاصول النبي صلى الله عليه وسلم[۳] - یعنی "درایت وہ علم ہے جس میں حدیث کے معنی و مفہوم کا کھوج لگایا جاتا ہے کہ زبان عربی کے قواعد اور شریعت کے ضوابط اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصول کے مطابق الفاظ حدیث سے حقیقی مراد کیا ہے"۔

---

۱ مقدمہ اصح السیر، ۲ تذکرۃ السامع۔ ۳ تعلیقات تذکرۃ السامع

امام ربیع ابن خیثم درایت کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ ان للحدیث ضوءً کضوء النهار تعرفه وظلمة کظلمة اللیل تنکره یعنی "حدیث میں ایک روشنی ہوتی ہے دن کی روشنی جیسی، اور ایک تاریکی ہوتی ہے رات کے اندھیرے کی طرح۔ اسی روشنی اور تاریکی میں تمیز کرنا درایت ہے۔"

یہی وہ درایت ہے جسکی بنا پر علامہ ابن قیم نے بعض روایتوں کے متعلق صاف صاف کہہ دیا کہ "اگر ایسی روایتوں کی اسناد آفتاب کی طرح ہوں تب بھی وہ غلط محض اور وہم ہوں گی۔"

پس درحقیقت حدیث میں درایت سے کام لینا صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جن کو احادیث رسول اللہ اور سیرۃ نبویہ پر کامل عبور اور ملکۂ راسخہ حاصل ہوگیا ہو اور جنکی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہو اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو خوب پہچان گئے ہوں۔ ایسے لوگ حدیث کے الفاظ اور طرز کلام اور دوسرے قرائن کو دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ آنحضرت کا کلام ہے یا کسی اور کا۔ ایک مشاق انشاپرداز، ایک کہنہ مشق شاعر، ایک حاذق طبیب، ایک تجربہ کار جوہری، ایک ماہر سنار جسطرح کلام کی بندش، مریض کی حالت، ہیرے کی جوت اور سونے کے عیار کو بیک نظر دیکھ کر ماہرانہ رائے دے سکتا ہے، اسی طرح ایک تجربہ کار اور وسیع النظر محدث اور فقیہ بھی احادیث کے متعلق اپنی درایت و بصیرت سے رائے قائم کرسکتا ہے۔ مگر اسکے لیے کوئی ایسا قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا کہ اسے سیکھ کر ہر شخص پرکھنے پر قادر ہو جائے۔ قادر تو وہی ہوگا جو مشق و مزاولت سے اسی طرح کا ملکہ پیدا کرلے۔ ایسا شخص بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اسلیے کہ اسکی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی سی جوت دیکھ لیتی ہے، اور اسکی روح روحِ محمدی میں گم اور اسکی نظر بصیرۃ نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام درایت ہے۔

تاریخ اور حدیث کا فرق اس دورِ تحقیق میں جہاں اور بہت سی غلط فہمیاں اور خام خیالیاں احادیث

نبوی کے متعلق پیدا کی جارہی ہیں، وہاں ایک یہ بھی عجیب خیال ہے کہ حدیث کی قدر و قیمت محض تاریخ ہونے کی حیثیت سے ہے، رہے دینی احکام تو انکی بنیاد حدیث پر رکھنا درست نہیں۔ اس خیال کی تائید میں جو دلیل بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ "حدیث کا اعتماد رواۃ کے اعتماد پر قائم ہے اور رواۃ کا اعتماد ان کے معاصروں کی شہادت پر مبنی ہے جو بالکل ایک تاریخی چیز ہے، اس لیے اس تاریخی چیز پر بجز تاریخ کے دین کی تعمیر نہیں ہو سکتی"۔ میرے نزدیک اس استدلال اور استنتاج میں تحقیق کم، اور خوش فہمی کا دخل بہت زیادہ ہے۔ اگر اس دعوے کے پیش کرنے والوں نے کچھ تحقیق سے کام لیا ہوتا تو وہ اتنی کھوکھلی اور بے اصل بات نہ کہتے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت از روئے قرآن اور از روئے اعتقاد کیا ہے اور ابتدا سے کیا رہی ہے؟ کیا وہ حضورؐ کو محض زمانۂ گذشتہ کا ایک لیڈر سمجھتے ہیں جس طرح اور دوسرے لیڈر پہلے گذر چکے ہیں؟ کیا آپ کا عہد انکی نگاہ میں محض ایک پچھلے زمانہ کا تاریخی عہد ہے؟ کیا ان کا تعلق اس عہد سے بس اتنا ہے جتنا اموی، اور عباسی، اور سلجوقی عہد سے ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی زندگی سے مسلمانوں کی دلچسپی بس اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کی دلچسپی وہ ہارون و مامون اور نظام الملک طوسی وغیرہ تاریخی شخصیتوں کے ساتھ رکھتے ہیں؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو اس کو اپنے ایمان بالرسالت پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اگر وہ تسلیم کرتا ہے کہ حضور اکرم اور آپ کے دور کی حیثیت ہمارے لیے محض تاریخی نہیں ہے، بلکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اور آپ کی سیرت کا ایک ایک جزء ہمارے لیے نمونۂ تقلید ہے، اور ہم کو اسلام کے راستہ پر چلنا ہی آپ کے طریق زندگی سے معلوم ہوتا ہے، اور ہمارے لیے اپنے دین کو پوری طرح سمجھنا ہی ناممکن ہے جب تک کہ ہم اس عہد کے حالات سے واقف نہ ہوں جس میں قرآن نازل ہوا اور قرآنی تعلیمات کا عملاً مظاہرہ کیا گیا، تو اس حقیقت

کو تسلیم کرنے کے ساتھ ہی یہ بات تسلیم کرلینا آپ سے آپ لازم ہوجاتا ہے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی اور آپ کے عہد کے حالات ہمارے لیے تاریخی نہیں بلکہ دینی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاریخی طور پر کسی قدیم عہد یا کسی گذری ہوئی شخصیت کے متعلق کچھ ثابت ہوجائے تو اس سے ہم پر کوئی چیز لازم نہیں آتی۔ لیکن آنحضرت صلعم اور آپ کے دور کے متعلق کوئی چیز ثابت ہوجائے تو ہم پر لازم ہوجاتا ہے کہ اسکی پیروی کریں، اس کو حق سمجھیں اور اس پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھیں۔ اسی طرح کسی دوسری شخصیت یا عہد کے متعلق کوئی غلط چیز مشہور ہو اور وہ تاریخ سے ثابت نہ ہو تو اس سے ہماری زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، لیکن سیرت نبوی یا دور نبوی کے متعلق کوئی غلط بات مشہور ہوجائے تو اس سے ہمارے دین پر حرف آتا ہے، ہماری زندگی کی اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی بنیادوں پر اثر پڑتا ہے اور ہم پر لازم ہوجاتا ہے کہ اسکی تردید کرکے اس کے برے اثرات کو محو کردیں۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے سیرت نبوی اور سیر صحابہ اور عہد رسالت کے حالات کی چھان بین اور تحقیق کے ساتھ وہ اعتناء کیا جو آج تک کسی تاریخی شخصیت اور کسی تاریخی دور کے حالات کی تحقیق سے دنیا کی کسی قوم نے نہیں کیا۔ کیا کہیں دنیا میں اسکی مثال ملتی ہے کہ کسی انسان کے رہنے سہنے اور اسکے خانگی معاملات اور اسکی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز کا اس طرح کھوج لگایا گیا ہو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا لگایا گیا؟ کیا کہیں اسکی مثال ملتی ہے کہ لوگ سینکڑوں اور ہزاروں میل سفر کرکے یہ معلوم کرنے جائیں کہ ایک شخص جو اُن سے پہلے گذر چکا ہے وہ کس طرح وضو کرتا تھا، کیوں کر نماز پڑھتا تھا، کیا کھاتا تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کیسے رہتا تھا؟ اور کیا اسکی کوئی مثال دنیا میں ملتی ہے کہ لوگ کسی پچھلے زمانہ کے انسان کی زندگی کے حالات سندوں کے ساتھ نوٹ کریں، اور ایک ایک واقعہ کے متعلق تفصیل کے ساتھ یہ معلوم کریں کہ اس واقعہ کو کس نے کس سے سنا؟ اور کیا کہیں اسکی مثال بھی ملتی ہے کہ جن

لوگوں نے اس شخص کے حالات بیان کیے ہوں خود ان کے حالات کی بھی تحقیق کر ڈالی جائے کہ وہ سچے تھے یا جھوٹے اور ان کا حافظہ درست تھا یا نہ تھا اور وہ ذمہ دارانہ طریقہ پر روایات نقل کرتے تھے یا غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ پوری انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اب غور کرو کہ آخر اسی ایک ذات اور اسی ایک دور کے معاملہ میں یہ نرالا اور انوکھا طرزِ تحقیق کیوں اختیار کیا گیا؟ کیا یہ تابعین و تبع تابعین اور بعد کے محدثین دیوانے تھے کہ ایک ایسی چیز کی تحقیق و تفتیش میں انہوں نے اتنا سر کھپایا جسکی کوئی قدر و قیمت تاریخی حیثیت سے بڑھ کر نہ تھی؟ اگر وہ ذات محض ایک تاریخی شخصیت ہوتی تو جس طریقہ پر آج ایک شخص سکندر اور تیمور اور نپولین کے حالات لکھ دیتا ہے اسی طرح وہ لوگ بھی لکھ دیتے۔ انہیں آخر کیا بیماری ہوئی تھی کہ محض تاریخ مرتب کرنے کی غرض سے جگہ جگہ مارے مارے پھرتے اور ایک ایک شخص سے پوچھتے پھرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فلاں واقعہ تم نے کس سے سنا تھا اور اس نے کس سے سنا تھا، اور دوسرے کن کن لوگوں نے اس واقعہ کی خبر کس کس سے پائی ہے، اور جن جن لوگوں نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے وہ کہاں تک قابلِ اعتبار ہیں؟

جن لوگوں کو اللہ نے عقل دی ہے، اور جو ایمانداری کے ساتھ حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں، وہ اگر ان امور پر غور کرینگے تو ان کا دل گواہی دیگا کہ یہ سارا کام جو کیا گیا ہے، محض تاریخ نگاری کے لیے نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اُس انسانِ اعظم کا طرزِ زندگی اور طریقِ عمل معلوم کرنے کی ضرورت تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اسی لیے بھیجا تھا کہ لوگوں کو مسلمان کی طرح زندگی بسر کرنے کا طریقہ سکھائے۔

تم چاہو تو اس کو "تاریخ" کے نام سے موسوم کر لو۔ مگر یاد رکھو کہ یہ تیمور یا نپولین کی تاریخ نہیں ہے بلکہ خدا کے نبی کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ سے جو کچھ ثابت ہو جائے اس کی پیروی کرنا ایک مسلمان پر لازم

ہو جاتا ہے۔ اور اس تاریخ سے جو بات غلط ثابت ہو اسے مٹا دینا ہر مسلمان کے لیے فرض و واجب ہے۔ اس تاریخ کا اور دوسری تاریخوں کا یہ اصولی فرق اگر تم کو تسلیم ہے تو تمہیں اختیار ہے کہ اسے حدیث یا سنت کے بجائے "تاریخ" کے نام سے یاد کرو محض الفاظ اور اسماء میں جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رہا یہ خیال کہ روایات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا ثبوت ویسا ہی ظنی ہوتا ہے جیسا تاریخی واقعات کا ثبوت ظنی ہوا کرتا ہے، تو یہ بات تحقیق کے خلاف ہے دنیا کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جسکی سند اس طرح تسلسل کے ساتھ عینی شاہدوں تک بہ سند پہنچتی ہو جس طرح حدیث میں پہنچتی ہے، اور نہ دنیا کے کسی تاریخی واقعہ کے متعلق ایسے ذرائع تحقیق کہیں موجود ہیں جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے متعلق تحقیق کے ذرائع موجود ہیں۔ لہذا احدیث کی روایات کو عام تاریخی روایات کی سی حیثیت دینا محض ایک جاہلانہ بات ہے۔ البتہ یہ بات ضرور صحیح ہے کہ اخبار احاد سے کسی امر کا جو ثبوت بہم پہنچتا ہے وہ ظنی ثبوت ہے، لیکن ہم اس سے پہلے قرآن سے ثابت کر چکے ہیں کہ جس نوعیت کا ظن غالب مستند روایات سے حاصل ہوتا ہے اسکی پیروی کرنا نہ صرف درست ہے بلکہ اسکی پیروی نہ کرنا مذموم ہے۔ لہذا وہ لوگ غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ دین میں صرف یقینیات کی جگہ ہے اور ظنیات سب کے سب بلا استثناء دین سے خارج کر دیے جانے چاہییں۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ دین کے دو حصے ہیں۔ ایک عقائد سے متعلق ہے جن پر آدمی کے مسلمان یا کافر ہونے کا مدار ہے۔ اور دوسرا حصہ احکام شرعیہ سے متعلق ہے جن پر کفر و اسلام کا مدار نہیں ہے۔ یقینیات کی ضرورت صرف پہلے حصہ کے لیے ہے رہا دوسرا حصہ تو اس میں ظن غالب کی پیروی کی جا سکتی ہے اور نہ صرف کی جا سکتی ہے، بلکہ اسکے بغیر چارہ نہیں۔ اس بات کو آپ ایک سیدھی سی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے اور آپ کی طرف سے ایک شخص یمن کی حکومت پر

مامور ہے۔ حضور اس شخص کے پاس ایک قاصد کے ذریعہ سے حکم بھیجتے ہیں کہ فلاں فلاں چیزوں کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اور اتنی مقدار سے کم مال چرانے میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ اب غور کیجیے کہ اس شخص کو کیا کرنا چاہیے؟ حکم صرف ایک آدمی لایا ہے۔ اس کے بیان اور جملہ قرائن پر نظر کرنے سے اس امر کا ظن غالب تو حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ حضور کا قاصد ہے اور جو کچھ بیان کر رہا ہے، وہ حضور کی طرف سے ہے، لیکن ایسا علم اس ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتا جس پر علم یقین کا اطلاق ہو سکے۔ اب کیا اس عامل کے لیے یہ درست ہوگا کہ ظن غالب کی پیروی سے انکار کر دے اور کہدے کہ جب تک ہزار آدمی میرے پاس متواتر خبرے کر نہ آئینگے میں ہر چیز کی چوری پر لوگوں کے ہاتھ کاٹتا رہونگا؟

اس مثال پر جو لوگ انصاف کے ساتھ غور کرینگے وہ بآسانی اس بات کو سمجھ لینگے کہ پہلے تو حدیث کو تاریخ کے درجہ تک گرانا، اور پھر یہ کہنا کہ تاریخی طور پر جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ محض ظنی ہوتی ہے اور کوئی ظنی چیز دین کے کسی شعبہ میں بھی جگہ نہیں پا سکتی، یہ سراسر ایک جاہلانہ طرز استدلال ہے۔ اور اس میں صرف جہالت ہی نہیں بلکہ حماقت اور بلادت ذہن بھی کار فرما ہے۔

حدیث کی اشاعت کے لیے صحابہ کا اہتمام | حدیث کی یہی شرعی نہ کہ تاریخی حیثیت تھی جس کی وجہ سے صحابہؓ کرام اور خود خلفائے راشدین نے اس کی اشاعت کا بطور خاص اہتمام کیا، اور صحابہ و تابعین کے دور میں مسلمانوں نے اس علم کو حاصل کرنے کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ ذیل کے مستند واقعات پر نگاہ ڈالیے اور غور کیجیے کہ کیا محض تاریخی معلومات کو پھیلانے کے لیے بھی کبھی وہ اہتمام کیا جا سکتا تھا جو حدیث کی اشاعت کے لیے کیا گیا ہے:۔

(۱) حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں بہت سی احادیث کو لفظ بلفظ نقل کرا کے اضلاع کے حکام کے پاس بھیجا۔ یہ احادیث اکثر شرعی مسائل اور احکام سے متعلق تھیں۔

(۲) صحابہ میں جو لوگ فن حدیث کے ارکان تھے ان کو مختلف ممالک میں حدیث کی تعلیم کے لیے بھیجا گیا چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں، "فاروق اعظم بسیارے از امہات فن حدیث روایت کردہ است و در دست مردم تاہنوز باقی است، بعد از ان فاروق اعظم علماء صحابہ را باقلیم دار الاسلام رواں ساخت و امر کرد باقامت شہرہا و بروایت حدیث در آنجا"[۱]

(۳) حضرت ابو ذر غفاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو لوگوں تک پہنچانا اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ بخاری میں ان کا یہ مقولہ موجود ہے کہ "اگر تم میرے قتل کے لیے میری گردن پر تلوار رکھ دو اور مجھے یہ امید ہو کہ مرنے سے پہلے رسول اللہ صلعم کا ایک کلمہ بھی جو میں نے سنا ہے پہنچا سکونگا تو میں ضرور کہدونگا"[۲]

(۴) حضرت ابو سعید خدری کے حالات میں لکھا ہے کہ جب وہ حدیث روایت کرتے تھے تو آدمیوں کی دیوار سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔

(۵) بعض صحابہ آدمیوں کے ہجوم کی وجہ سے مکانوں کی چھت پر چڑھ کر حدیث روایت کرتے تھے،

(۶) حضرت امیر معاویہ، شام سے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد تمہیں معلوم ہو تو مجھے لکھ بھیجو۔

(۷) حضرت عبداللہ بن عباس جو نبی صلعم کے زمانہ میں کم سن تھے بعض بڑی عمر کے صحابہ کے دروازہ پر صبح سے دوپہر تک صرف اس غرض سے بیٹھے رہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلعم کی کوئی بات بیان کریں تو یہ اسے نوٹ کر لیں[۳]۔

(۸) علامہ ذہبی حضرت ابو درداء صحابی کے حالات میں ایک تابعی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں

---

[۱] ازالۃ الخفاء - [۲] بخاری شریف - [۳] دارمی

کہ میں نے ابو درداء رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تو ان کے ساتھ اتنے لوگ ہوتے تھے جیسے کسی بادشاہ کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پوچھ رہے تھے۔[1]

(۹) امام زہری نے حدیث و روایت کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے۔ جوان، بڈھے، عورت، مرد جو ملجاتا حتی کہ پردہ نشین عورتوں تک سے جاکر آنحضرت صلعم کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلمبند کرتے۔ ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایات کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو بقول علامہ ذہبیؒ صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں[2]، باقی حالات آپ کے اوپر گذر چکے ہیں۔

[1] تذکرۃ الحفاظ۔ [2] مقدمۂ سیرۃ النبی۔ بعض خوش فہم لوگوں نے امام زہری کو بنو امیہ کا وظیفہ خوار قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ "امام زہری جنکو حدیث کا موجد کہنا چاہیے وہ بنی امیہ کے وظیفہ خوار تھے ان کو اقرار ہے کہ انہوں نے حدیثیں اس لیے وضع کیں کہ سلاطین نے ان سے ایسی خواہش کی" سچ ہے بقول سعدیؒ، ہنر بچشم عداوت بزرگتر عیب است۔ یہ تحقیق انیق انگلینڈ کے ایک جی پروفیسر سے ماخوذ ہے، جسکا دندان شکن جواب حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے معارف ۲۷ء؁ میں دیا ہے۔ ہم اسکی تلخیص افادۂ ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں "یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ امام زہری سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے۔ ہشام ابن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم موصوف کے سپرد کی تھی۔ بیشک امام زہری کا یہ قول موجود ہے "اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء" یعنی "اس کام پر ہم کو امراء نے مجبور کیا" اب فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کام پر مجبور کیا؟ ضرورت ہے مشار الیہ کا بقیہ ٹکڑا ابھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے۔ عن عبد الرزاق عن معمر عن الزھری قال کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء فرأینا ان لا یمنعہ احد من المسلمین۔ (ابن سعد جزء ۲ قسم ثانی صفحہ ۱۳۵) - یعنی "عبدالرزاق معمر سے اور معمر زہری سے روایت کرتے ہیں کہ زہری کہتے ہیں کہ ہم لوگ علم حدیث کو لکھنا پسند نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ ہمکو بادشاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰ پر ملاحظہ ہو)

(۱۰) فتنۂ خلق قرآن کے فرو ہو جانے کے بعد جب خلیفہ متوکل نے علماء سنت کو روایت حدیث کی عام پروانگی عنایت کی تو ایک محدث ابن ابی شیبہ کے گرد اول ہی مجلس میں تیس ہزار طالبان حدیث ...... پروانہ وار جمع ہو گئے - یہ وہ زمانہ تھا کہ ابن ابی شیبہ کے ہمسر بلکہ ان سے فائق تر ائمہ محدثین ملک میں موجود تھے - پھر جب ایک محدث کی پہلی مجلس میں اتنے طلبہ تھے تو دوسروں کے ہاں کسقدر ہونگے

"قیاس کن زگلستان من بہار مرا"

(۱۱) امام ابو حاتم رازیؒ حدیث کی طلب میں ۳ ہزار میل سفر کرتے ہیں اور پھر شمار کرنا چھوڑ دیتے ہیں - ابن المقریؒ نے ۴۰۰ میل اخذ حدیث میں سفر کیا - امام ابن طاہر مقدسیؒ حدیث کی تحصیل میں پیادہ پا چلتے یہانتک کہ پیشاب میں خون آجاتا - امام بخاریؒ کی زندگی میں امام موصوف سے ۹۰ (نوے) ہزار اشخاص نے بلا واسطہ بخاری شریف کو سنا - موطا امام مالکؒ کو امام عالی مقام کی زندگی میں ہزار آدمیوں نے سنکر جمع کیا - جب امام علی رضا رضی اللہ عنہ نیشا پور تشریف لیگئے تو آپ سے صرف ایک

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹ - نے (یعنی خلفاء بنو امیہ نے) اس کے لکھنے پر مجبور کیا، اور اب ہماری رائے یہ ہے کہ کوئی مسلمان اب اسکو منع نہ کرے" یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبد البر (صفحہ ۳۶ مصر) تقیید العلم ابن جوزی اور تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے - اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے کہ بعض علماء ابتدا میں حدیث کے لکھنے سے منع کرتے تھے اور بشدت اس سے پرہیز کرتے تھے - مگر سلاطین بنو امیہ نے زور دیا کہ احادیث کو ضبط تحریر میں لاکر محفوظ کر دیا جائے - آخر کار امام زہری کو بھی اس کی مصلحت معلوم ہوئی اور انہوں نے اس کی تعمیل کی - غور کرو کہاں زہری کا یہ اقرار کہ احادیث کو کتابوں میں محفوظ کر دینے کی جو رائے سلاطین نے دی تھی اسے صائب پاکر ہم نے یہ کام انجام دیا اور کہاں اس قول کو یہ معنی پہنانا کہ سلاطین کے مجبور کرنے سے انہوں نے حدیثیں گھڑیں - اللہ اکبر

"ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا"

حدیث لینے کے لیے ۲۰ ہزار آدمی قلم دوات اور کاغذ لیے موجود تھے ۔ شہر رقّہ کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کی تشریف آوری پر آپ کے اردگرد طالبین حدیث کے دل بادل جمع ہو گئے، اس قدر کشمکش ہوئی کہ لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں، اور اس منظر کو دیکھ کر خلیفہ ہارون الرشید کی بیگم کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے کہ سلطنت اس کو کہتے ہیں ۔

ان واقعات پر غور کرو ۔ کیا یہ محنتیں جو محدثین نے روایات جمع کرنے کے لیے کیں محض تاریخی ذوق کی بنا پر تھیں ؟ کیا وہ مسلمان جو ہزاروں کی تعداد میں ایک ایک محدث کے گرد جمع ہو جایا کرتے تھے، ان کو محض تاریخ کا شوق کھینچ کر لے جاتا تھا ؟ کیا وہ اہتمام جو صحابہ اور تابعینؒ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور ارشادات جمع کرنے کے لیے کیا وہ محض اس وجہ سے تھا کہ ذاتِ رسالت پناہی سے ان کو محض تاریخی دلچسپی تھی ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں ہے، تو ان واقعات کی کوئی توجیہ بجز اس کے نہیں کی جا سکتی کہ حدیث کے ساتھ علماء اور عام مسلمانوں کا شغف صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اسوۂ حسنہ سمجھتے تھے اور اپنی زندگیوں کو آپ کے طریقہ پر ڈھالنے کے لیے آپ کی زندگی کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے تھے، اور اسی لیے انہوں نے آپ کی سیرت پاک کے صحیح و مستند حالات معلوم کرنے اور محفوظ کرنے کے لیے وہ تدبیریں اختیار کیں جو آج تک کسی تاریخی شخصیت کے لیے نہیں کی گئیں ۔

الٰہی معجزہ یہاں پہنچ کر دیدۂ بینا رکھنے والے آدمی کو صاف نظر آجاتا ہے کہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور نزول قرآن کے ماحول اور قرآنی ہدایت کے ظہور کی پوری کیفیت کو محفوظ رکھنے کے لیے جو کچھ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے کیا اس میں دراصل وہی خدائی ہاتھ کام کر رہا تھا جس نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا ۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ قرآن کو آخری ہدایت نامہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آخری نبی بنایا تھا، اور چونکہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ یہ کتاب اور یہ نبی بنی نوع انسان کے لیے دائمی

ہدایت کا سرچشمہ بننے والا تھا۔ اس لیے اس نے نہ صرف قرآن کی حفاظت کے لیے وہ انتظام کیا جو اُس سے پہلے اور اُس کے بعد دنیا کی کسی کتاب کے لیے نہیں ہوا، بلکہ ساتھ ہی اس نے ایسا انتظام بھی کر دیا کہ وہ پورا دور جس میں قرآن نازل ہوا اور جس میں قرآن کے لانے والے نے ہدایت و ارشاد کی خدمت انجام دی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے تاکہ ہر زمانے کے لوگ دیکھ سکیں کہ قرآن کی تعلیم کا مقصد کس قسم کے انسان اور کس قسم کی سوسائٹی پیدا کرنا ہے، اور قرآنی اخلاق، قرآنی سیاست، قرآنی تمدن و تہذیب، قرآنی طرزِ زندگی کا نقشہ کیسا ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خدائی حکمت و قدرت کی نشانیوں میں سے ایک عظیم الشان نشانی ہے کہ آخری نبوت کے دور اور اس سے قریب کے زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کو آئندہ نسلوں کے متعلق اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا، جنہوں نے نوع انسانی کے آخری رہنما کی زندگی کے ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ تک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی کوشش کی، اور جنہوں نے اس خدمت کے انجام دینے میں اُس ذہانت، اُس محنت اور اُس تن دھی سے کام لیا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتنے ہی انبیاء گذر چکے ہیں۔ مگر آج کسی کی صحیح تاریخ پیدائش تک دنیا میں محفوظ نہیں ہے۔ حضور صلعم کے بعد کتنی ہی ایسی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کو دنیا والوں نے عظمت کا درجہ دیا۔ لیکن ان میں سے کسی کے حالات بھی ایسے موثق ذرائع تحقیق کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں جو قوی احادیث تو درکنار ضعیف سے ضعیف احادیث کے مقابلہ میں بھی رکھے جا سکیں۔ پھر کیا اس کو الٰہی معجزہ کے سوا کچھ اور کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ انسانی میں صاحبِ قرآن کی شخصیت ہی ایسی شخصیت ہے، اور نزول قرآن کا دور ہی ایسا دور ہے جس کی ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک اس طرح محفوظ کر کے رکھ دی گئی ہیں جیسے کھوٹے سکوں کے ڈھیر میں سے ایک کھرا سکہ الگ نکال کر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس روشن ترین حقیقت کی قدر جن کے دل میں نہیں ہے اور جو اس آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خود اپنی بدبختی کا ثبوت دیتے ہیں۔ (باقی)

حقیقتِ نفاق

منافقین کی صفات اور ان کی اقسام

(۴)

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

یہ ضعف ایمان، جس کو قرآن نے نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبہ قرار دیا ہے، اس وقت دنیا کے مسلمانوں پر ایک بلائے عام اور مرض مزمن کی حیثیت سے چھایا ہوا ہے۔ ضعف ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی مسلمان نہ ہو، یا خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت کو نہ مانے، یا نماز اور روزہ اور حج وغیرہ ارکان و فرائض دینی سے انکار کرے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کو اپنا ایمان اور اپنا اسلام اتنا عزیز نہ ہو کہ اسکی خاطر وہ اپنے آرام، اپنی آسائش، اپنے مال اپنی جان اور نفسانی اغراض کو قربان کر سکے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود کفر کے غلبہ و تسلط کو قبول کرے اور اسکی حکمرانی کے آگے سر جھکا دے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ آدمی دل اور زبان سے تو خدا کے قانون کی برتری کا اقرار کرے مگر عملاً خدائی قانون کو زمین میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سے جی چرائے اور اُن قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جن سے خدا راضی نہیں ہے یہ ہے ضعف ایمان کی تعریف۔ اس تعریف کو نگاہ میں رکھیے اور پھر زمین ... کے ایک ایک گوشہ پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ کس جگہ کے مسلمان ضعف ایمانی کے اس داغ سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکے ہیں اور شیطانی قوانین کی گرفت سے آزاد ہو کر صحیح معنوں میں اسلامی زندگی ... بسر کرنے کی

آزادی حاصل کئے ہوئے ہیں۔

دورُخے لوگ (۱۱) قرآن میں ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر موجود ہے جو اعتقادی حیثیت سے توحید پرستی اور شرک کے بیچ میں معلّق تھا۔ یہ لوگ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اقرار تو کرتے تھے، اور اللہ کی عبادت سے بھی منکر نہ تھے، مگر ہنوز ان کے دلوں سے اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللہِ کی عظمت کے نقوش محو نہ ہوئے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب تک فائدہ رہتا، خدا کی عبادت کرتے رہتے۔ اور جب کوئی مصیبت آتی تو خدا کے سوا ہر اس مخلوق سے دعائیں مانگنے اور منتیں کرنے لگتے جس سے ان کو حاجت روائی کی توقع ہوتی۔ قرآن ان لوگوں کے حق میں کہتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللهَ — اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی عبادت تو کرتے

عَلٰی حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ اِطْمَاَنَّ	ہیں مگر تذبذب کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی اس طرح کہ
بِہٖ وَاِنْ اَصَابَتْہُ فِتْنَۃُ اِنْقَلَبَ عَلٰی	اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچا تب تو مطمئن رہے اور اگر
وَجْھِہٖ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ذٰلِکَ ھُوَ	کوئی مصیبت آپڑی تو الٹے منہ پھر گئے۔ دنیا اور
الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ	آخرت دونوں سے گئے، اسی کا نام خسران مبین
اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہٗ وَمَا لَا یَنْفَعُہٗ	...... (کھلا نقصان) ہے۔ یہ لوگ (مصیبت کے
ذٰلِکَ ھُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ یَدْعُوْا لَمَنْ	وقت) خدا کو چھوڑ کر ان سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں
ضَرُّہٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِہٖ لَبِئْسَ	جو نہ تو ان کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں نہ نقصان
الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ (الحج - ۲)	پہنچانے کی۔ یہی ہے پرلے درجے کی گمراہی۔ یہ لوگ

(مصیبت کے وقت خدا کو چھوڑ کر) اُنہیں پکارتے ہیں جن کا نقصان ان کے نفع کی بہ نسبت زیادہ یقینی ہے۔ کیا ہی برا ہے (یہ) مولیٰ (یعنی مرجوع الیہ) اور کیا ہی برا ہے یہ ساتھی (یعنی رجوع کنندہ)۔

اگرچہ اس گروہ کے لیے قرآن میں لفظِ منافق استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن ان کی جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ نفاق کی تعریف میں آجاتی ہے۔ یہ ایک طرف خدا کا اقرار اور اسکی عبادت کرتے ہیں اور دوسری طرف غیر خدا کو حاجت روا بھی بناتے ہیں، یعنی ایک راستہ سے اسلام میں داخل ہوئے اور دوسرے راستہ سے نکل گئے۔ اسی کا نام نفاق ہے۔

شرک اور توحید کا یہ جوڑ بھی کیسا عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کو آحد واحد بھی تسلیم کرنا اور پھر دوسروں کو قاضی الحاجات بھی سمجھنا، یہ بوالعجبی یقیناً ہمارے لیے بڑی ہی حیرت کی چیز ہوتی اگر آج ہماری آنکھوں کے سامنے "بزرگوں" کی قبریں اور پیروں کی خانقاہیں نہ ہوتیں۔ ہر صبح اور ہر شام ایک دو نہیں لاکھوں "مسلمانوں" کو ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی وہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آگے سر جھکائے ہوئے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پڑھ رہے تھے،

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ[1] اور لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَھُمْ[2] کا اقرار کر رہے تھے اور اسکے چند ہی لمحوں بعد وہی "مسلمان" قبروں کے آگے اپنی ہی جیسی لاچار اور عاجز محض مخلوق سے مرادیں مانگ رہے ہیں اور گڑگڑا کر دعائیں کر رہے ہیں۔ انسانوں کو "مشکل کشا" اور "غوثِ اعظم" (سب سے بڑا فریاد رس!) اور "دستگیر" (مصیبت کے وقت ہاتھ پکڑنے والا) کہا جا رہا ہے مصیبت کے وقت خدا سے مدد مانگنے کے بجائے یا علی المدد اور یا غوث اغثنی اور یا پیر دستگیر کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ اولاد اور نوکری اور مقدمہ کی کامیابی اور ایسی ہی دوسری اغراض کے لیے خدا کے بجائے اُس کے بندوں کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اگر مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے۔ یہاں تک تو خیر، یہی غنیمت ہے کہ خدا کی عبادت کا مقام، بندوں کو پکارنے کے مقام سے الگ رکھا گیا ہے۔ مگر اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگوں نے تو یہ غضب کیا کہ خدا کے گھر میں، ٹھیک اس جگہ جہاں خدائے واحد کی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے، یا شیخ فلاں شیئاً للہ[3] کے کتبے نصب کر ڈالے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو خود اسکے گھر میں جا کر چیلنج دے دیا گیا۔

---

[1] اور فتح و کامرانی تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے (آل عمران)۔ [2] یہ خود ساختہ معبود ان مشرکوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

[3] اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہے "اے شیخ فلاں، کچھ خدا کے لیے"، یعنی خدا کے لیے کچھ عنایت فرمایئے۔ اس کے معنی و مفہوم پر غور کیجیے۔ اس میں دراصل توسّل کے مسئلے کو الٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ توسّل کے معنی تو یہ ہیں کہ اصل دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور ہم اُسکے مقربوں میں سے کسی کو وسیلہ قرار دے کر اللہ سے مانگتے ہیں۔ مگر یہاں اسکے برعکس اللہ کو وسیلہ قرار دے کر شیخ صاحب سے مانگا جا رہا ہے، گویا اصل دینے والے شیخ صاحب ہیں اور اللہ اُن کا مقرب ہونے کی وجہ سے وسیلہ بنایا جا رہا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کے معنی کو سمجھ کر اس کلمہ پر ایمان لایا ہو وہ کس طرح اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ خداوند عالم کو کسی بندے کے پاس وسیلہ قرار دے کر دعا کی جائے۔ اور لطف یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ ہو)

منافقین کی ایک اور قسم منافقین کی مذکورۂ بالا اقسام تو وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی اس زمانہ میں پائی جاتی ہے جسکا وجود عہد نزول قرآن میں نہیں تھا، اور نہ قدرتاً ہونا چاہیے تھا۔ یہ قسم اُن نسلی اور خاندانی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے دماغ تو غیر اسلامی نظریات اور اصولوں پر پوری طرح ایمان لائے ہوئے ہیں اور اس کے بالمقابل وہ اسلامی اصول اور قرآنی تصورات سے یکسر بغاوت کر چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کو "مسلمان" کہنے اور مسلمان کہلائے جانے پر مصر ہیں، اور ان کا یہ اصرار کسی غرض یا کسی ذاتی مصلحت پر مبنی نہیں ہے، جیساکہ دوسرے منافقوں کا خاصہ ہے، بلکہ انہیں لفظ "اسلام" اور "مسلمان" کے ساتھ ایک گہرا پیدائشی تعلق ہے اور اس تعلق کے قیام و بقا میں وہ سخت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دنیا میں بے شمار قومیں ہیں اسی طرح انھوں نے "مسلمان" کے لفظ کو بھی ایک قوم کے نام کی حیثیت دے رکھی ہے، اور جس طرح ہر انسان کو اپنی قوم سے ایک خصوصی لگاؤ ہوتا ہے ـــــ خواہ اس میں اور اسکے دوسرے ہم قوم افراد میں کتنا ہی زبردست اختلاف فکر و نظر کیوں نہ موجود ہو ـــــ اور نفسیاتی اعتبار سے اس لگاؤ میں اتنی مضبوطی ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان کسی قیمت پر اس لگاؤ کو قربان نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح یہ مسلمان زادہ بھی اپنی قومیت کے نشان یعنی لفظ مسلمان کو اپنے سے جدا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، اور جب کوئی موقع قومی حمایت کا آتا ہے تو دوسرے منافقین کی روش کے برعکس یہ "مسلم قوم" کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا ہے، اور اس جانفروشی کے مظاہرہ میں نہ تو اُس کی کسی بدنیتی کا دخل ہوتا ہے نہ خود غرضی یا جاہ طلبی کا، بلکہ یہ اثر ہوتا ہے محض اس تعصب

بقیہ حاشیہ ص ۴۹ - عین مسجد کی محراب میں اسے لکھ کر لگایا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر اور کیا جرأت ہو سکتی ہے؟ جو گھر مخصوص کیا گیا تھا ایک خدا کی بڑائی کا اعلان کرنے کے لیے اس کو بھی ان نام نہاد مسلمانوں نے نہ چھوڑا اور وہاں بھی بندوں ہی کی بڑائی کا اعلان کیا۔ اسکے بعد بھی اگر یہ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃ [illegible] میں گرفتار نہ ہوتے تو معاذ اللہ خدا کی کتاب جھوٹی ثابت ہو جاتی۔

کا جو اسے اپنی قومیت کے ساتھ ہے۔ یہ چیز دنیوی لحاظ سے خواہ کتنی ہی قابل قدر ہو مگر اسکو کیا کیجیے کہ اسلام کی نگاہ میں اسکی کوئی قیمت نہیں۔ اسلام کوئی آبائی اور پیدائشی دین نہیں ہے بلکہ ایک خاص مسلک ہے جو غور و فکر کے بعد اطمینان قلب کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسلک کو سمجھ کر اس پر ایمان نہیں لایا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے بعض شعبوں میں یا تمام میں کسی دوسرے مسلک کے اصول و نظریات کی رہنمائی قبول کرتا ہے تو اس کا محض وہ پیدائشی تعصب، جو اسے لفظ "اسلام" کے ساتھ ہے، قرآن کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

آپ اس "نیک نیت" اور "مخلص" منافق کو صرف اس بنا پر معاف نہیں کر سکتے اور نہ اسے منافق کہنے سے باز رہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ اس کی نیت بے لوث ہے اور وہ مسلم قوم کا بہر حال بہی خواہ ہے، کیونکہ جو شخص اُن اصول اور اساسات ہی کو نہیں مانتا، بلکہ عملاً اُن کی جڑیں کھودتا ہے، جن پر اسلام کا وجود منحصر ہے، اور جو شخص لفظ مسلمان کا اطلاق تو اپنے اوپر کرتا ہے مگر اسکے معنی اور اس کی روح سے قطعاً خالی ہے، اس کی ایک نہیں ہزار قربانیاں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بیکار محض ہیں۔ وہ نادانستہ طور پر اسلام کے گھر میں اسلام کا دشمن ہے۔ وہ مخلص ہوتے ہوئے بھی منافق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اور منافقوں کی طرح اس کا نفاق شعوری اور ارادی نہیں بلکہ غیر شعوری اور غیر ارادی ہے۔ آپ بہت رعایت کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے دل کو مسلمان کہہ لیجیے لیکن اُس کے دماغ کو تو مسلمان کہنے کی کوئی گنجائش آپ کو نہیں مل سکتی۔ اور قرآن کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی کو اسلامیت کا اعزاز نہیں بخشتا جب تک کہ اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں قرآنی رنگ میں رنگے ہوئے نہ ہوں۔ یہ قرآن کا اصول ہے، غیر متبدل اور بے لاگ اصول، جس میں نہ کسی مداہنت کی گنجائش ہے نہ کسی رُو رعایت کی۔

اگر آپ گہری نظر سے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو بے شمار دردمندانِ ملت ایسے نظر آئیں گے

جنکی کسی حرکت سے مسلم دشمنی اور خود غرضی کا شبہ تک نہ ہو سکے گا، بلکہ ان کی ساری زندگیاں قوم مسلم کی تعمیر و ترقی میں وقف نظر آئیں گی، لیکن جس وقت آپ عام معیار خدمت و ایثار کو چھوڑ کر قرآن کے معیار پر ان کے خیالات اور انکی زندگی کا جائزہ لینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد تک پر ایمان نہیں رکھتے۔ قرآن کے واضح اور صریح احکام کی نہ صرف خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ نظری حیثیت سے بھی ان احکام کو غلط سمجھتے ہیں اور مغرب کے اخلاقی، تمدنی اور قانونی نظریات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر انکی وہ خدمات جن کا ذکر کر کے ہم سے کہا جاتا ہے کہ انکی قدر کرو، انہیں جب ہم زیادہ گہری نظر سے جانچ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ جن تعلیمی یا سیاسی یا تنظیمی ادارات کو چلا رہے ہیں وہ غیر اسلامی تصورات اور غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہیں، اور مسلمانوں کو قرآن کے نصب العین اور قرآن کے قانون حیات سے دور لیے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا دنیوی اعتبار سے مسلمان ان کو خواہ اپنے لیے کتنا ہی مفید سمجھیں، قرآنی نقطۂ نظر سے یہ ہرگز کسی قدر کے مستحق نہیں ہیں۔

منافقین کی اقسام بڑی اور اصولی تقسیم کے اعتبار سے یہی ہیں۔ اگر تمام منافقوں کو ایک قوم یا ایک نسل تصور کر لیا جائے تو ان بارہ اقسام مذکورہ کو اس قوم کے بڑے بڑے قبیلے سمجھنا چاہیئے، جن میں سے ہر قبیلہ کے تحت بے شمار خاندان ہیں۔ لہٰذا اصلیت کے لحاظ سے منافقوں کی اقسام کو صرف اسی بارہ کی تعداد میں محدود نہ سمجھنا چاہیئے، بلکہ ان کی صحیح تعداد تو سانپوں کی طرح ان گنت ہے۔ اور خود نفاق کی فطرت اور اس کی حقیقت ہی اس دعوی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں ضرورت نہیں کہ مزید تجزیہ کر کے ہر چھوٹے سے چھوٹے گروہ کا ذکر تفصیل کی روشنی میں لائیں۔ کیونکہ آپ جس نوع منافقین کو بھی لیں گے وہ انھیں بارہ جنسوں میں سے کسی نہ کسی جنس کے تحت ہوگی، اور قرآنی قانون کی رو سے اس کا حکم وہی ہوگا جو اس کی جنس کا ہوگا۔ رہ گیا یہ سوال کہ ان تمام اقسام منافقین کے بارے میں قرآن کا حکم کیا ہے، اور ان کے ساتھ مسلمانوں کو کس طرح پیش آنے کی ہدایت کی گئی ہے، تو اس

بحث پر کلام کرنے سے پہلے ہم ان تمام صفات اور اعمال اور علامات کو اکٹھا کر دینا چاہتے ہیں جو منافقین کے ساتھ مخصوص ہیں، تاکہ ایک ایسا جامع مرقع نفاق تیار ہو جائے جس میں ہر منافق کی صورت بآسانی دیکھی جاسکے۔

علامات نفاق سطور بالا میں منافقین کے حالات اور ان کی صفات پر جو تفصیلی گفتگو کی جاچکی ہے اس کے بعد صفات اور علامات نفاق کو یکجا بیان کرتے وقت کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔ یہاں ہم صرف مختصراً نفاق کی علامات کو نمبروار درج کر دینے ہی پر اکتفا کرینگے تاکہ ناظرین مجموعی طور پر ان سب کو بیک نظر دیکھ لیں۔ قرآن کی رو سے نفاق کی علامتیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) ظاہر اور باطن کا مختلف ہونا، يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ۔ (فتح - ۲)

(۲) خود غرض اور موقع پرست ہونا، الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِن كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ الخ (نساء - ۲۰)

(۳) خطرات کے وقت اصول کی پابندی کو اور راہِ حق میں اظہار عزیمت کو ناعاقبت اندیشی اور بے وقوفی سمجھنا۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ الخ (بقرہ - ۱)

(۴) اسلام اور امت اسلامیہ کے مصائب پر مسرور ہونا اور اس کی ترقی اور خوشحالی کو دیکھ کر جل اٹھنا۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا (آل عمران - ۱۲)

(۵) مصالح اسلامی کے خلاف سازشیں کرنا۔ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ الخ (النساء - ۱۱)

(۶) اسلامی سیاسیات سے متعلق اہم امور کو، جنھیں اہل حل و عقد کے پاس صیغۂ راز میں رکھنا

چاہیے، عوام میں مشہور کر دینا۔ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ
(النساء-۱۱)

(۷) ارشادات نبوی اور فرامین الٰہی کے خلاف سرگوشیاں کرنا۔ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ
(مجادلہ-۲)

(۸) اہل حق اور اہل باطل دونوں سے فریب کارانہ راہ و رسم رکھنا تاکہ ہر ایک کی مخالفت سے امن حاصل رہے۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ (النساء-۱۲)

(۹) قوانین اسلام کو اور خصوصاً جہاد کو خلاف امن اور خلاف مصلحت بلکہ وجہ فساد اور ناقابل عمل سمجھنا، اور اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کے وضع کردہ خودغرضانہ طرز عمل کو بنائے صلح و آشتی سمجھنا۔ ...... قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ (بقرہ-۲)

(۱۰) مفسدہ پرداز ہونا۔ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا۔ (النساء-۱۲)

(۱۱) اسلام کو آج قبول کرنا اور کل اس سے برگشتہ ہو جانا، محض اس لیے تاکہ عوام کو اسلام سے نفرت پیدا ہو۔ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ ..... الخ
(آل عمران-۸)

(۱۲) کفار اور دشمنان اسلام سے موالات رکھنا۔ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (نساء-۲۰)

(۱۳) اسلام کی محارب اور بدخواہ قوتوں کو مسلمانوں کے مقابل امداد دینا یا امداد کا وعدہ کرنا لَئِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ۔ (حشر-۲)

(۱۴) کفار کے ہاں عزت کا طالب ہونا۔ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ (النساء-۲۰)

(۱۵) اسلامی عدالت کے بجائے ایسی عدالتوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرانا جو غیر اسلامی قانون پر عمل کرتی ہوں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ۔ (نساء-۹)

(۱۶) شریعت کے قانون پر محض اس وقت عمل کرنا جب کہ اپنا فائدہ ہوتا ہو۔ اور جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شریعت کا فیصلہ انکی خواہشات کے خلاف ہوگا وہاں اس سے دور بھاگنا اور صاف لفظوں میں اسے ٹھکرا دینا۔ وَاِذَا دُعُوْا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ (النور-۶)

(۱۷) حق کے واضح ہو جانے اور اسے حق جان لینے کے باوجود غرور اور خود پرستی کی وجہ سے اور جھوٹی عزت کے خیال سے اپنی غلط روش پر جمے رہنا۔ وَاِذَا قِیْلَ لَہٗ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (البقرہ-۲۵)

(۱۸) اخلاق اور تقویٰ کے بجائے نسلی اور قومی امتیازات کو وجہ عزت و ذلت سمجھنا اور انہیں امتیازات کا سوال اٹھا کر امت میں نسلی گروہ بندی پیدا کرنا۔ یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ۔ (منافقون-۲)

(۱۹) تقویٰ اور مغفرت کو ہیچ اور اپنے کو ان چیزوں سے بلند و برتر اور بے نیاز سمجھنا۔ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوَّوْا رُءُوْسَھُمْ وَرَاَیْتَھُمْ یَصُدُّوْنَ وَھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ (منافقون-۱)

(۲۰) اپنی عقل و فہم کو معیار حق سمجھنا اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کا مذاق اڑانا یا ان پر نکتہ چینی کرنا۔ وَیَقُوْلَ.... مَاذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا۔ (منافقون-۱)

(۲۱) نماز اور اذان کا بلکہ تمام شعائر اسلامی کا مذاق اڑانا۔ وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا

هُزُوًا وَّلَعِبًا۔ (مائدہ - ۸)

(۲۲) اللہ تعالیٰ کو، اُس کے رسول کو، اور اس کی آیات کو، دل لگی کا سامان بنانا۔ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (توبہ - ۸)

(۲۳) مال دار مسلمانوں کے مخلصانہ انفاق فی سبیل اللہ پر ریاکاری کا الزام لگانا اور غریب مسلمانوں کے تھوڑے صدقات کی ہنسی اڑانا۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ..... فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ۔ (توبہ - ۱۰)

(۲۴) خدا سے یہ دعا کرنا کہ اگر مجھے تو نے مال دیا تو تیری راہ میں خرچ کرونگا لیکن مالدار ہونے کے بعد اس عہد کو فراموش کر دینا اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے بخل کرنا۔ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ۔ (توبہ - ۱۰)

(۲۵) اگر راہِ خدا میں کبھی کچھ خرچ کیا بھی تو قلبی کراہیت اور تنگ دلی کے ساتھ۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۔ (توبہ - ۷)

(۲۶) راہ خدا میں صرف کرنے کو مفت کا تاوان اور لاحاصل خرچ سمجھنا۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا۔ (توبہ - ۱۲)

(۲۷) دوسرے مسلمانوں کو مساکین امت پر حسبۃً للہ خرچ کرنے سے روکنا تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی ساکھ برباد ہو جائے۔ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا۔ (منافقون - ۱)

(۲۸) حرام خوری میں بے باک ہونا۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ ..... وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ۔ (مائدہ - ۹)

(۲۹) لوگوں کو اچھے کاموں سے روکنا اور برائی کی تلقین کرنا۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ۔ (توبہ۔ ۹)

(۳۰) جماعت میں فحش اور بداخلاقی کی ترویج کرنا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (نور۔ ۲)

(۳۱) شیرازۂ ملت کو مذہبی فرقہ بندیوں کے ذریعہ درہم برہم کرنا۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا الخ (توبہ۔ ۱۳)

(۳۲) اپنے آپ کو ظلم اور گناہ کے لیے وقف کر دینا۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (مائدہ۔ ۹)

(۳۳) جھوٹ کا عادی ہونا اور لوگوں کو فریب دے کر اپنی مطلب برآری کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا۔ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (منافقون۔ ۸)

(۳۴) کسی کے ساتھ بھی سچی وفاداری نہ کرنا اور پاس عہد سے سروکار ہی نہ رکھنا۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ ... وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (حشر۔ ۲)

(۳۵) بغیر کسی کارنامہ کے سرانجام دیئے ہوئے محض جھوٹی شہرت کا حریص ہونا۔ وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا۔ (آل عمران۔ ۱۹)

(۳۶) بے حسی قلب کے باعث سچائی اور نیکی کی حقیقتوں کے ادراک سے عاجز ہونا۔ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (منافقون۔ ۱) فَمَالِ هٰؤُلَاۤءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (النساء۔ ۱۱)

(۳۷) بزدل ہونا - وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ (توبہ - ۷)

(۳۸) اعدائے اسلام سے درپردہ خوشامدانہ ربط ضبط رکھنا، صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ کوئی گزند نہ پہنچا دیں - فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ - (مائدہ - ۸)

(۳۹) بزدلی کی وجہ سے ہر مصیبت کو خواہ اس کا رخ کسی کی طرف ہو اپنے ہی لیے سمجھنا - وَيَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ - (منافقون - ۱)

(۴۰) اپنے مسلم ہونے پر توفیق الٰہی کا شکر گذار ہونے کے بجائے الٹا اللہ اور اس کے رسول اور عام امت مسلمہ پر احسان رکھنا - يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (حجرات - ۲)

(۴۱) نماز کی ادائگی اور پابندی کو گراں محسوس کرنا - محض لوگوں کو دکھلانے کی خاطر نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا مگر اس طرح الکساتے ہوئے آنا جس سے صاف ظاہر ہو کہ بادلِ ناخواستہ آئے ہیں - وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ[1] (نساء - ۲۱)

(باقی)

[1] یہ آیت ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کر رہی ہے - اس میں منافقین کی علامت یہ نہیں بتائی گئی کہ وہ نماز کے لیے مسجدوں میں نہیں آتے بلکہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ الکساتے ہوئے آتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز، مومن اور کافر کے درمیان حد فاصل تھی - جو شخص موذن کی پکار پر مسجد میں نہ پہنچتا اسکے متعلق سمجھ لیا جاتا تھا کہ اسلام اسے قبول نہیں ہے، اور اس بنا پر وہ جماعت سے خارج کر دیا جاتا تھا - لہٰذا اس زمانہ میں ہر اس شخص کو نماز کے وقت مسجد میں حاضر ہونا پڑتا تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہنا چاہتا ہو، عام اس سے کہ وہ مومن ہو یا منافق - منافقین اگرچہ دل سے نماز کو فرض نہیں سمجھتے تھے اور نہ اسے ادا کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ انہیں اپنی منافقانہ اغراض کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ اسلامی جماعت میں گھسے رہیں، اسلیے وہ نماز کے اوقات میں مجبوراً مسجد جاتے تھے - اس وقت مومن اور منافق کے درمیان تمیز صرف اس طرح ہوتی تھی کہ مومن ایسے ذوق شوق کے ساتھ آتے تھے جیسے کہ وہ احساس فرض سے خود بخود کھنچے چلے آ رہے ہیں - اور منافقین اس طرح بادلِ ناخواستہ آتے تھے کہ جیسے زبردستی اپنے آپ کو کھینچے لا رہے ہیں - اب صورت معاملہ بالکل بدل گئی ہے - آج کسی منافق کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہنے کے لیے نمائشی نماز کی بھی حاجت نہیں رہی، کیونکہ اس کے بغیر بھی وہ مسلمان سمجھا جا رہا ہے - لہٰذا آج نماز مومن اور

رسائل و مسائل

مغربی نیشنلزم اور فرنگی لباس

(۲)

یہی ہے وہ یورپ کا نیشنلزم جس کے نشہ میں سرشار ہو کر کوئی پکارتا ہے "جرمنی سب سے اوپر (Deutschlandüber alles)۔ کوئی نعرہ بلند کرتا ہے "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے"۔ کوئی اعلان کرتا ہے "اٹلی ہی مذہب ہے"۔ کسی کی زبان سے دنیا کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ "حکومت کرنا برطانیہ کا حق ہے"۔ اور ہر قوم پرست اس مذہبی عقیدہ پر ایمان لاتا ہے کہ "میرا ملک! خواہ حق پر ہو یا ناحق پر"۔ یہ قوم پرستی کا جنون آج دنیا میں انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے۔ انسانی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ انسان کو اپنی قوم کے سوا ہر دوسری قوم کے لیے درندہ بنا دیتا ہے۔

اس نیشنلزم کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد، خوشحال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک شریف جذبہ ہوتا۔ لیکن درحقیقت محبت سے زیادہ عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات اس کو جنم دینے اور پرورش کرتے ہیں۔ اس کا مادۂ حیات دراصل وہ آگ ہے جو قومیت کے مجروح جذبات اور کچلے ہوئے قومی حوصلوں سے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہ آگ ـــ یہ حمیت جاہلیہ قومی محبت کے شریفانہ جذبہ کو بھی حد سے بڑھا کر ایک ناپاک چیز بنا دیتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز اُن بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی

غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے، واقعی یا خیالی طور پر، کی ہوں لیکن چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم، کوئی الٰہی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی اسلیے یہ اپنی حد سے گذر کر قیصریت (Imperialism)، معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism)، نسلی منافرت، جنگ اور بین الاقوامی بدامنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زمانۂ حال کا ایک مصنف فرانسس کوکر (Francis W. Coker) لکھتا ہے :-

"بعض قوم پرست اہل قلم دعویٰ کرتے ہیں کہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا حق دنیا کی صرف ترقی یافتہ قوموں کو ہے ــــ ان قوموں کو جو ایسا اعلیٰ درجہ کا تہذیبی اور روحانی سرمایہ رکھتی ہیں جو اس کا مستحق ہے کہ دنیا میں باقی رکھا جائے اور پھیلایا جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کی مہذب قوم کا حق اور فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرے اور اپنے اندرونی معاملات کو دوسروں کی مداخلت کے بغیر سرانجام دے بلکہ اس کا حق اور فرض یہ بھی ہے کہ اپنے دائرۂ اثر کو ان قوموں پر پھیلائے جو نسبتہً پسماندہ ہیں، خواہ اسکے لیے قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک اونچے درجہ کی قوم اپنا ایک عالمگیر منصب رکھتی ہے، اسے اپنی قابلیتوں کو صرف اپنی ہی سرزمین میں مدفون کر دینے یا خود غرضی کے ساتھ صرف اپنی ہی ترقی کے لیے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ــــ یہی نظریہ اور یہی استدلال تھا جسے عموماً انیسویں صدی کے آخری دور میں ملک گیری کی تائید کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی حجت کو پیش کر کے افریقہ اور بحرالکاہل کی "نیم مہذب" قوموں کو یورپ اور امریکہ کی سلطنتوں کا تابع فرمان بنایا گیا تھا ......"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے :-

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی قوم صرف یہی حق نہیں رکھتی کہ براہِ راست جو حملہ اس پر کیا جائے اسکی مدافعت کرے، بلکہ یہ بھی اس کا حق ہے کہ ہر اُس چیز کی مزاحمت کرے جس سے اس کے ایسے مفادات پر زد پڑتی ہو جو اسکی خود مختارانہ زندگی اور خوشحالی کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اسکی زندگی کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ بس اپنی سرحدوں کی حفاظت کرلے، اور اپنے مادی وسائل پر خود قابو یافتہ رہے، اور اپنی عزت کو پامال نہ ہونے دے۔ نہیں، اُسے اگر زندہ رہنا ہے تو اس سے زیادہ بھی کچھ کرنا پڑیگا۔ اسکو بڑھنا چاہیے، پھیلنا چاہیے، اپنی فوجی طاقت بڑھانی چاہیے، اپنا قومی دبدبہ قائم کرنا چاہیے، ورنہ وہ رفتہ رفتہ گرتی چلی جائیگی اور بالآخر قوموں کی مسابقت میں اس کا وجود محو ہو کر رہ جائیگا۔ جو قومیں اپنے مفاد کی حفاظت کرتے اور اپنے سیاسی و معاشی نفوذ واثر کا دائرہ بڑھانے میں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں وہی زندہ رہنے کی زیادہ حقدار ہیں جنگ قومی توسیع کا فطری ذریعہ ہے، اور جنگ میں فتح یاب ہونا قوم کے اصلح ہونے کی دلیل ہے۔ والٹر بیج ہاٹ کے بقول وہ جنگ ہی ہے جو قوموں کو بناتی ہے۔"

اسکے بعد وہ لکھتا ہے:

"(ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء کو بھی ان خیالات کی تائید میں غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے)۔ ارنسٹ ہیکل (Ern st Haeckel) جو جرمنی میں ڈارونیت کا پہلا اور سب سے زیادہ با اثر پیغمبر گذرا ہے اور جس نے اپنے علم الحیات (Biology) کے نظریات کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ فلسفہ اور اجتماعیات میں استعمال کیا ہے، خود غرضی و خود پرستی کو عالمگیر قانونِ حیات قرار دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہ قانون انسانی سوسائیٹی کے اندر ایک طرح کی نسلی مردم خوری کی صورت میں جاری ہوتا ہے۔ اسکی رائے میں زمین اُن تمام نسلی گروہوں کے لیے کافی سامانِ زندگی نہیں رکھتی جو اُس کی آغوش میں جنم لیتے ہیں۔ لہٰذا کمزور گروہ فنا ہو جاتے ہیں، نہ صرف اس وجہ

سے کہ زمین کے محدود وسائل زندگی سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو عام تنازع برپا ہوتا ہے اس میں وہ دوسرے گروہوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کرسکتے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ زیادہ طاقت ور گروہوں کے فاتحانہ اقدامات کی مدافعت کا کس بل اُن میں نہیں ہوتا - اسی طرح کارل پیرسن (Karl Pearson) بین الاقوامی کشمکش کو "نوع انسانی کی فطری تاریخ کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے - اس کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی کے علمی تصور (Scientific view of life) کی رو سے انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اس نزاع و جدال کی وجہ سے ہوتا ہے جو صرف افراد ہی کے درمیان نہیں بلکہ قوموں کے درمیان بھی دائماً برپا رہتی ہے - جب ایک اعلیٰ درجہ کی قوم اپنی کمزور نسلوں کو مٹا اور صرف طاقتور نسلیں پیدا کرنے کا انتظام کر کے اندرونی حیثیت سے اپنی صلاحیت بڑھا لیتی ہے، تب وہ دوسری قوموں سے مقابلہ کر کے بیرونی حیثیت سے اپنی صلاحیت کو ترقی دینا شروع کرتی ہے - اس نزاع میں کمزور (غیر صالح) قومیں کچلی جاتی ہیں - طاقت ور (صالح) قومیں باقی رہتی ہیں - اور اس طرح مجموعی حیثیت سے پوری نوع انسانی کا قدم ترقی کی طرف بڑھتا ہے - ایک قوم دوسری عالی مقام قوموں کے ساتھ اپنی برابری کا ثبوت اسی طرح دے سکتی ہے کہ وہ ان سے تجارتی راستوں اور خام پیداوار کے وسائل اور سامان غذا کے ذخائر کے لیے پیہم مجاہدہ کرتی رہے - فروتر درجہ کی قوموں (کمزور قوموں) سے واسطہ پڑنے کی صورت میں اگر وہ ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرتی اور ان سے گھلتی ملتی ہے تو گویا خود ہی اپنے دعوائے بالاتری سے دست بردار ہو جاتی ہے - اور اگر وہ انہیں زمین سے نکال کر خود قبضہ کر لیتی ہے، یا انہیں زمین میں باقی رکھ کر اپنے فائدہ کے لیے استعمال کرتی ہے تو اپنی بالاتری ثابت و قائم کر دیتی ہے۔"[1]

ایک دوسرا مصنف جوزف لیٹن (Joseph A. Leighton) لکھتا ہے :-

[1] *Recent Political Thought*, New York, 1934, Pp. 443-48.

"پندرھویں صدی سے دنیا کی تاریخ زیادہ تر قومی ریاستوں کے درمیان معاشی رقابتوں کی داستان ہے۔ معاشی قوم پرستی روز بروز قوموں کے درمیان تصادم کا سبب بنتی چلی گئی ہے۔ پہلے تجارت کے میدان میں مزاحمت کا سلسلہ چلتا ہے، پھر جنگ ہوتی ہے۔ امریکہ، افریقہ، سات سمندروں کے جزائر اور ایشیا کے ایک بڑے حصہ پر تسلط، نوآبادیوں کا قیام اور ان ممالک کے معاشی وسائل سے انتفاع، یہ سب کچھ اسی داستانِ قزاقی کے مختلف ابواب ہیں۔ اگرچہ یہی سب ذرا چھوٹے پیمانہ پر اس وقت بھی ہوا تھا جب زوالِ روما کے بعد وحشی قومیں تاخت و تاراج کرتی ہوئی پھیل گئی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ رومن امپائر کے باقیات سے تو مذہبی اخلاقی اور تہذیبی بنیادوں پر ایک بین الاقوامی نظام تعمیر ہو گیا تھا، لیکن دنیائے جدید میں یہ نہ ہو سکا"[۱]

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے:

"جب ایک ایسی قوم جو تہذیبی وحدت رکھتی ہو، سیاسی حیثیت سے خود مختار، اور معاشی حیثیت سے متحد الاغراض ہوتی ہے، اور اس تہذیبی، سیاسی، معاشی قومیت میں اپنی عظمت اور برتری کے احساسات اُبھر آتے ہیں، تب معاشی قوم پرستی اپنی شدید تر صورت میں رونما ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان مسابقت و مزاحمت کا جو سسٹم اس وقت قائم ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی قوم پرستی ہے۔ اور یہ قوم پرستی بہت جلدی معاشی امپیریلزم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قومیں تجارتی فوائد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد کرتی ہیں اور بیرونی ممالک کی منڈیوں اور پسماندہ ممالک کی معاشی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے درمیان کشمکش ہوتی ہے......"

"سیاسی اور معاشی نیشنلزم کی گتھی (جس کو سلجھانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی) یہ ہے

۱؎ *Social Philosophies in Conflict*, New York, 1937, P. 439.

کہ ایک طرف تو قومی ریاست کا وجود ایک قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے، اور اسکی محض معاشی خوشحالی ہی نہیں بلکہ اسکی تہذیبی ترقی، اسکی تعلیم، اسکے سائنس، اسکے فنون، غرض اسکی ہر چیز کے نشو و نما کا انحصار قومی ریاست کے پھلنے پھولنے ہی پر ہے۔ لیکن دوسری طرف موجودہ مسابقت کے ماحول میں خود بخود معاشی نیشنلزم پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر قوم دوسری قوموں کے نقصان پر پھلنے پھولنے کی کوشش کرتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے درمیان رقابت، شبہات، خوف اور نفرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ معیشت کے میدان میں بین الاقوامی مسابقت سے کھلے میدان میں فوجی تصادم تک سیدھا راستہ جاتا ہے اور یہ بہت قریب کا راستہ ہے[۱]"

میں نے مغربی نیشنلزم کو اور اس کے انداز فکر اور طریق کار کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے خود اہل مغرب کے الفاظ میں نقل کرنا زیادہ پسند کیا تاکہ اسکی پوری تصویر خود گھر والوں کے مُوقلم سے کھنچی ہوئی آپ کے سامنے آجائے۔ اوپر کے اقتباسات اس امر کی بیّن شہادت پیش کرتے ہیں کہ یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشو و نما ہوا ہے وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انہوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد، ظلم، اور خونریزی سے بھرنے والے، اور انسانی تہذیب کے پرامن نشو و ارتقاء کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے نبی جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں، اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں، یہ شیطانی اصول ان کے مدمقابل، ان کے مزاحم اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل، تنگ نظر[۲] اور متعصب بناتے ہیں۔ یہ قوموں اور نسلوں

---

[۱] حوالۂ مذکور صفحہ ۴-۵۔ [۲] قوم پرستانہ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ جاپان میں ہندوستان کے آم کا داخلہ بند ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ ہو)

کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادّی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاقی حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتی ہیں۔

الٰہی شریعتوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی اور روحانی رشتے قائم کر کے انہیں وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے۔ مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی سے ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کر کے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور معاند بنا دیتا ہے[۱]۔

الٰہی شریعتیں چاہتی ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں کیونکہ انہی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے، مگر نیشنلزم ان روابط کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ ایک قوم کے حلقۂ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتا ہے۔

الٰہی شریعتوں کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی طبعی خصوصیات اور پیدائشی قابلیتوں کے نشو و نما کا پورا موقع ملے تاکہ وہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر نیشنلزم ہر قوم اور ہر نسل میں یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ طاقت حاصل کر کے دوسری قوموں اور نسلوں کو ادنیٰ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴۔ گویا ایک نعمت جو اللہ نے زمین پر پیدا کی ہے، ایک قوم کے لوگ اپنے اوپر اسکو صرف اس لیے حرام کر لیتے ہیں کہ وہ دوسری قوم کے ملک میں کیوں پیدا ہوئی۔ [۱] ابھی پچھلے ہی سال نیشنلزم کا یہ کرشمہ ساری دنیا نے دیکھا کہ برما کے ہولناک فسادات میں جنکا محرک برمی نیشنلزم کا جذبہ تھا، برمی بودھوں نے عام ہندوستانیوں کی طرح ہندوستانی بودھوں کو بھی نہایت بے دردی کے ساتھ قتل و غارت کیا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم کی مقراض نے اس روحانی و اخلاقی رشتہ کو قطع کر کے رکھ دیا جسے بودھ مت نے ایک ہندوستانی اور ایک برمی کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہ نیشنلزم کا فطری خاصّہ ہے۔ اسی نے مسیحی قوموں کے درمیان بھی رشتہ اخوت کو اسی طرح کاٹا تھا، اور اب مسلمان قوموں کے درمیان بھی کاٹ رہا ہے، چنانچہ شام کی سرحد پر ترکوں اور عربوں کے درمیان جو صورت حال اس وقت رونما ہے وہ اسی نیشنلزم کا نتیجہ ہے۔

اور ذلیل اور بے قدر و قیمت قرار دے، اور انہیں غلام بنا کر انکی پیدائشی قابلیتوں کو بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ہی نہ دے، بلکہ ان سے زندگی کا حق ہی سلب کر کے چھوڑے۔

الٰہی شریعتوں کا اساسی اصول یہ ہے کہ طاقت کے بجائے اخلاق پر انسانی حقوق کی بنیاد قائم ہو، حتی کہ ایک طاقتور شخص یا گروہ، کمزور شخص یا گروہ کے حق کو بھی ادا کرے جبکہ قانونِ اخلاق اسکی تائید میں ہو۔ لیکن نیشنلزم اسکے مقابلہ میں یہ اصول قائم کرتا ہے کہ طاقت ہی حق ہے اور کمزور کا کوئی حق نہیں اس لیے کہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

شرائع الٰہیہ جس طرح اخلاقی حدود کے اندر نفس پروری کی مخالف نہیں ہیں اسی طرح وہ قوم پروری کی بھی مخالف نہیں ہیں۔ درحقیقت وہ اسکی تائید کرتی ہیں، کیونکہ ایک ایک قوم کے اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے ہی پر مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی کا مدار ہے۔ لیکن آسمانی شریعتیں ایسی قوم پروری چاہتی ہیں جو انسانیت عامہ (Humanity at large) کی طرف ہمدردی، معاونت اور خیر خواہی لیے ہوئے بڑھے اور وہ خدمت انجام دے جو سمندر کے لیے زمین کے دریا انجام دیتے ہیں۔ برعکس اسکے نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے اور انسانیت عامہ کا نہ صرف یہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت "خود غرضی" کی ہے، اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت "قوم پرستی" کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرتاً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابل قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو۔ اس ذہنیت کا مکمل نمونہ ہم کو جرمنی کے نیشنل سوشلزم میں نظر آتا ہے۔ ہٹلر کی زبان میں نیشنل سوشلسٹ کی تعریف یہ ہے کہ:

"ہر وہ شخص جو قومی نصب العین کو اس حد تک اپنانے کے لیے تیار ہو کہ اسکے نزدیک اپنی قوم

کی فلاح سے بالاتر کوئی نصب العین نہ ہو، اور جس نے ہمارے قومی ترانے "جرمنی سب سے اوپر" کے معنی و مقصود کو اچھی طرح سمجھ لیا ہو، یعنی اس وسیع دنیا میں جرمن قوم اور جرمنی سے بڑھ کر کوئی چیز اسکی نگاہ میں عزیز اور محترم نہ ہو، ایسا شخص نیشنل سوشلسٹ ہے[۱]"

اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں ہٹلر لکھتا ہے:

"اس زمین میں جو کچھ قابل قدر ہے ــــ سائنس، آرٹ، فنی کمالات اور ایجادات ــــ وہ سب کا سب چند گنی چنی قوموں کی تخلیقی قابلیتوں کا نتیجہ ہے اور یہ قومیں اصل میں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں .... اگر ہم نوع انسانی کو تین قسموں میں تقسیم کریں ــــ کلچر کے بنانے والے - اسکی حفاظت کرنے والے - اس کو غارت کرنے والے ــــ تو صرف آریہ نسل ہی کا شمار پہلی قسم میں کیا جا سکے گا[۲]"

اسی نسلی تفاخر کی بنیاد پر جرمنی میں غیر آریہ لوگوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے، اور اسی بنیاد پر جرمنی کی جہانگیری کا نظریہ قائم ہے - ایک نیشنل سوشلسٹ کے نزدیک دنیا میں جرمن قوم کا مشن یہ ہے کہ وہ "ادنیٰ درجہ" کی قوموں کو غلام بنا کر "تہذیب" پھیلانے میں آلہ کے طور پر استعمال کرے - اور یہ محض جرمنی ہی کی خصوصیت نہیں ہے - جمہوریت پسند امریکہ میں بھی رنگ کا امتیاز اسی بنیاد پر ہے ــــ سفید فام امریکن سیاہ فام حبشی کو انسان سمجھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ــــ اور یہی مسلک یورپ کی ہر قوم کا ہے خواہ وہ برطانیہ ہو یا فرانس یا اٹلی یا ہالینڈ -

پھر اس قوم پرستی کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو مطلب پرست بناتی ہے شرائع الٰہیہ تو دنیا میں اس لیے آئی ہیں کہ آدمی کو اصول پرست بنائیں اور اس کے طرز عمل کو ایسے مستقل اصول

---

۱ *History of National Socialism*, by Konrad Heiden. P. 85.

۲ *My Struggle*, Hurst and Blacket, London, Pp 120-21.

کا پابند بنا دیں جو اغراض اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والے نہ ہوں۔ لیکن قوم پرستی اسکے برعکس آدمی کو بے اصول بنا دیتی ہے۔ قوم پرست کے لیے دنیا میں کوئی اصول اسکے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم کا فائدہ چاہتا ہے۔ اگر اخلاق کے اصول، مذہب کے احکام اور تہذیب کے نظریات اس مقصد میں اسکے مددگار ہوں تو وہ ان پر ایمان لانے کا خوشی سے دعویٰ کرتا رہیگا۔ اور اگر وہ اس کے راستے میں حائل ہوں تو وہ ان سب کو بالائے طاق رکھ کر کچھ دوسرے اصول و نظریات اختیار کر لیگا۔ مسولینی کی سیرت میں ہم کو ایک قوم پرست کے کیرکٹر کا مکمل نمونہ ملتا ہے۔ جنگ عظیم سے پہلے وہ اشتراکی تھا۔ جنگ عظیم میں محض اس لیے اشتراکیوں سے الگ ہو گیا کہ اٹلی کے شریک جنگ ہونے میں اس کو قومی فائدہ نظر آتا تھا۔ پھر جب غنائم جنگ میں اٹلی کو مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو اس نے جدید فاشستی تحریک کا علم بلند کیا۔ اس نئی تحریک میں بھی وہ برابر اپنے اصول بدلتا چلا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ لبرل سوشلسٹ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انارکسٹ بنا۔ ۱۹۲۱ء میں چند مہینہ تک سوشلسٹ اور جمہوری طبقوں کا مخالف رہا، چند مہینہ انکے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتا رہا، اور بالآخر ان سے کٹ کر اس نے ایک نئی پالیسی وضع کر لی۔ یہ تلون، یہ بے اصولی اور یہ ابن الوقتی، مسولینی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ نیشنلزم کی فطرت کا طبعی خاصہ ہے۔ انفرادی زندگی میں جو کچھ ایک خود غرض آدمی کرتا ہے وہی قومی زندگی میں قوم پرست کرتا ہے۔ کسی اصول اور نظریہ پر مستقل ایمان رکھنا اسکے لیے ناممکن ہے۔

مگر نیشنلزم اور الٰہی شریعتوں میں سب سے زیادہ کھلا ہوا تصادم ایک اور صورت سے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آئیگا، وہ بہر حال کسی ایک قوم اور کسی ایک سرزمین ہی میں پیدا ہوگا اسی طرح جو کتاب اس نبی کو دی جائیگی وہ بھی لامحالہ اسی ملک کی زبان میں ہوگی جس میں وہ مبعوث ہوا ہے پھر اس نبوت کے مشن سے تعلق رکھنے والے جن مقامات کو عزت و احترام اور تقدیس کی حیثیت حاصل ہوگی وہ بھی زیادہ تر اسی ملک میں واقع ہونگے۔ مگر ان سب محدودیتوں کے باوجود وہ صداقت اور تعلیم

ہدایت جو ایک نبی خدا کی طرف سے لے کر آتا ہے، کسی قوم اور ملک کے لیے محدود نہیں ہوتی بلکہ تمام انسانوں کے لیے عام ہوتی ہے۔ پوری نوع انسانی کو اس نبی پر اور اسکی لائی ہوئی صداقت پر ایمان لانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ خواہ اس نبی کا مشن محدود ہو، جیسا کہ ہود اور صالح علیہما السلام اور بہت سے پیغمبروں کا تھا، یا اس کا مشن عام ہو، جیسا کہ حضرت ابراہیم اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہما کا تھا، بہرصورت ہر نبی پر ایمان لانے اور اس کا احترام کرنے کے لیے تمام انسان مامور ہیں۔ اور جبکہ کسی نبی کا مشن عالمگیر ہو تو یہ قدرتی بات ہے کہ اسکی لائی ہوئی کتاب کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگی۔ اسکی زبان کا تہذیبی اثر بین الاقوامی ہوگا، اسکے مقدس مقامات ایک ملک میں واقع ہونے کے باوجود بین الاقوامی مرکزیت حاصل کرینگے۔ اور نہ صرف وہ نبی، بلکہ اس کے حواری اور اسکے مشن کی اشاعت میں نمایاں حصہ لینے والے ابتدائی لوگ بھی، ایک قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام قوموں کے ہیرو قرار پائینگے ــــ یہ سب کچھ ایک نیشنلسٹ کے مذاق، اسکی افتاد طبع، اسکے جذبات اور اسکے نظریات کے خلاف ہے۔ نیشنلسٹ کی غیرت قومی اس کو کسی طرح گوارا نہیں کرسکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو ہیرو بنائے جو اس کی اپنی قوم کے نہیں ہیں، ایسے مقامات کی مرکزیت اور تقدیس و احترام قبول کرے جو اسکے اپنے وطن کے نہیں ہیں، ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اسکی اپنی زبان نہیں ہے، ان روایات سے روحانی تحریک (Inspiration) حاصل کرے جو باہر سے آئی ہوں۔ وہ اِن سب چیزوں کو نہ صرف اجنبی (Foreign) قرار دے گا، بلکہ انہیں اُس نفرت اور ناگواری کی نگاہ سے دیکھے گا جس سے بیرونی حملہ آوروں کی ہر چیز دیکھی جاتی ہے، اور اِن تمام خارجی اثرات کو اپنی قوم کی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کریگا۔ اس کے جذبۂ قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ اپنے جذبات تقدیس و احترام کو اپنے ہی وطن کی سرزمین سے وابستہ کرے۔ اپنے ہی وطن کے دریاؤں اور پہاڑوں کی حمد میں گیت گائے۔ اپنی ہی قوم کی پرانی تاریخی روایات کو (انہی روایات کو جنہیں یہ باہر سے آنے والا مذہب "عہد جاہلیت" سے تعبیر کرتا ہے) زندہ کرے اور ان پر

فخر کرے۔ اپنے حال کا رشتہ اپنے ہی ماضی سے جوڑے، اور اپنی قومی ثقافت کا تسلسل اپنے اسلاف ہی کی ثقافت کے ساتھ قائم کرے۔ اپنی ہی قوم کے تاریخی یا افسانوی بزرگوں کو اپنا ہیرو بنائے اور اُنہی کے خیالی یا واقعی کارناموں سے روحانی تحریک حاصل کرے۔ غرض یہ بات نیشنلزم کی عین طبیعت میں شامل ہے کہ وہ ہر اس چیز سے، جو باہر کی ہو، منہ موڑ کر اُن چیزوں کی طرف رخ کرے جو اسکے اپنے گھر کی ہوں۔ یہ راستہ جس آخری منزل پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے مذہب کو بھی کلّی طور پر چھوڑ دیا جائے اور ان مذہبی روایات کو زندہ کیا جائے جو خود اپنی قوم کے عہد جاہلیت سے کسی نیشنلسٹ کو پہنچی ہوں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نیشنلسٹ اس آخری منزل تک نہ پہنچے ہوں، اور ابھی بیچ ہی کی کسی منزل میں ہوں، مگر جس راستہ پر وہ گامزن ہیں وہ جاتا اِسی طرف ہے۔

آج جرمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیشنلزم کے اس فطری خاصّہ کی مکمل توضیح و تبیین ہے نازیوں میں سے ایک گروہ تو علانیہ حضرت عیسٰی سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہے اسلیے کہ وہ یہودی نسل تھے، اور کسی شخص کا یہودی ہونا اس بات کے لیے کافی وجہ ہے کہ ایک آریہ نسل کا پرستار اسکی تمام تہذیبی، اخلاقی اور روحانی قدر و قیمت سے انکار کر دے، چنانچہ اس گروہ کے لوگ بے تکلف کہتے ہیں کہ "مسیح ایک پرولتاری یہودی تھا، مارکس کا پیش رو، اسی لیے تو اس نے کہا کہ جو مسکین ہیں وہی زمین کے وارث ہونگے"۔ اس کے برعکس جن نازیوں کے دل میں ابھی تک مسیح کے لیے جگہ باقی ہے وہ ان کو نارڈک نسل کا ثابت کرتے ہیں۔ گویا ایک جرمن قوم پرست یا تو مسیح کو مانے گا نہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے، یا اگر مانے گا تو اسرائیلی مسیح کو نہیں بلکہ نارڈک نسل کے مسیح کو مانے گا۔ بہرصورت اس کا مذہب اسکی نسل پرستی کے تابع ہے کسی غیر آریہ شخص کو روحانی و اخلاقی تہذیب کا پیشوا ماننے کے لیے کوئی جرمن قوم پرست تیار نہیں۔[1]

[1] ٹھیک یہی ذہنیت عرب کے ان یہودیوں کی تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے سے صرف اسلیے انکار کر دیا تھا کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔

حد یہ ہے کہ جرمن قوم پرستوں کے لیے وہ خدا بھی قابلِ قبول نہیں جس کا تصور باہر سے درآمد ہوا ہے۔ بعض نازی حلقوں میں کوشش ہو رہی ہے کہ ان دیوتاؤں کو پھر زندہ کیا جائے جنہیں پرانے ٹیوٹن قبائل پوجا کرتے تھے۔ چنانچہ تاریخ قدیم کی چھان بین کر کے پوری دیو مالا تیار کر لی گئی ہے اور ووتان (Wotan) نامی دیوتا کو، جسے عہد جاہلیت کے ٹیوٹن لوگ "طوفانوں کا خدا" کہتے تھے، مہا دیو (Chief Diety) قرار دیا گیا ہے۔ یہ مذہبی تحریک تو ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر نازی نوجوانوں کو آج کل جس عقیدہ کی تعلیم دی جا رہی ہے اس میں بھی خدا کو رب العالمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض رب الالمانیین کی حیثیت سے خدا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس عقیدہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ہم خدا پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں کہ وہ قوت و حیات کا ازلی مظہر ہے، زمین میں اور کائنات میں ...۔ خدا کا خیال جرمن انسان کے لیے فطری ہے۔ خدا اور ازلیت کے متعلق ہمارا تصور کسی دوسرے مذہب یا عقیدہ کے تصورات سے کسی قسم کی مماثلت نہیں رکھتا۔ ہم جرمن قوم اور جرمنی کی ازلیت پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ قوت و حیات کی ازلیت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم زندگی کے نیشنل سوشلسٹ تصور پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قومی مقاصد کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قائد اڈولف ہٹلر پر ایمان رکھتے ہیں۔"

یعنی خدا اُس قوت و حیات کا نام ہے جو جرمن قوم میں حلول کر گئی ہے۔ جرمن قوم اس خدا کا ارضی ظہور ہے۔ ہٹلر اس کا رسول ہے، اور "قومی مقاصد" اس رسول کا لایا ہوا مذہب ہے ــــ ایک قوم پرست کی ذہنیت سے اگر کوئی مذہبی تصور مناسبت رکھتا ہے تو وہ بس یہی ہے۔

یورپین اصول پر جب نیشنلزم کو ترقی دی جائیگی تو وہ بالآخر اسی مقام پر پہنچ کر دم لیگی۔ جو لوگ ابھی بیچ کی منزلوں میں ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچے ہیں، انکے نہ پہنچنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ابھی تک ان کے جذبات قومیت کو ویسی سخت ٹھیس نہیں لگی ہے جیسی جرمنی کو گذشتہ جنگِ عظیم میں لگی

تھی - لیکن یقین رکھیے کہ جب وہ نیشنلزم کے راستہ پر گامزن ہوئے ہیں تو ان کی آخری منزل مقصود بہر حال وہی کمال درجہ کی جاہلی عصبیت ہے، جو خدا اور مذہب تک کو قومی بنائے بغیر مطمئن نہیں ہوتی۔ یہ نیشنلزم کی فطرت کا تقاضا ہے۔ نیشنلزم اختیار کر کے اس کے فطری تقاضے سے کون بچ سکتا ہے؟ غور کیجیے آخر وہ کیا چیز ہے جو قوم پرستانہ طرز فکر اختیار کرتے ہی ایک مصری نیشنلسٹ کا رخ خود بخود عہد فراعنہ کی طرف پھیر دیتی ہے؟ جو ایرانی کو شاہنامے کی افسانوی شخصیتوں کا گرویدہ بنا دیتی ہے؟ جو ہندوستانی کو "پراچین سمے" کی طرف کھینچ لے جاتی ہے اور گنگ و جمن کی تقدیس کے نزلے اسکی زبان پر لاتی ہے؟ جو ترک کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تمدنی زندگی کے ایک ایک شعبے سے عربی اثرات کو خارج کرے اور ہر معاملہ میں عہد جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرے؟ اس کی نفسیاتی توجیہ بجز اسکے آپ اور کیا کر سکتے ہیں کہ نیشنلزم جس دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اسکی تمام دلچسپیاں قومیت کے دائرے میں محدود ہو جاتی ہیں اور اس دائرے سے باہر کی ہر چیز سے اس کا رخ پھر جاتا ہے۔

میرے سامنے اس وقت انقرہ کے ڈائرکٹر جنرل آف پریس کا ایک مضمون رکھا ہے جس کا عنوان ہے "ترکی عورت تاریخ میں"۔ اس کے ابتدائی فقرے حسب ذیل ہیں:

"قبل اسکے کہ ہم اس بلند اور معزز مرتبے سے بحث کریں جو ہماری نوخیز جمہوریت نے ترکی عورت کو دینا پسند کیا ہے، ہمیں ایک نظریہ دیکھ لینا چاہیے کہ تاریخ کے مسلسل ادوار میں ترکی عورت کی زندگی کیسی رہی ہے۔ اس مختصر تبصرے سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ آج ترکی مردوں اور عورتوں میں جو مساوات پائی جاتی ہے وہ ہماری قومی تاریخ میں نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب تک ترکی خاندان اور ترکی نظام تمدن بیرونی اثرات سے آزاد تھا، ترکی عورت ہمیشہ ہر تمدنی تحریک میں حصہ لیتی تھی۔ ہمارے مشہور ماہر اجتماعیات ضیا گوک الپ نے اس مضمون کی

خوب تحقیق کی ہے، اور اسکی تحقیقات سے اُن بہت سے حقوق کا پتہ چلا ہے جو ترکی عورت کو پرانی ترکی تہذیب (؟ ترکی کے عہد جاہلیت) میں حاصل تھے۔ ان شہادتوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قدیم ترکی عورت اور آج کی ترکی عورت کے درمیان تمدنی و سیاسی لحاظ Emancipation کے اعتبار سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔"

ان فقروں کو دیکھیے - قوم پرست ترک کس طرح اپنی تاریخ کے اُس دور سے منہ موڑتا ہے جس میں اسکی قوم "بیرونی اثر" میں آگئی تھی، اور کس طرح اپنے حال کے لیے اپنے اُس ماضی کو "اسوۂ حسنہ" بناتا ہے جبکہ اسکی قوم اس بیرونی اثر سے آزاد تھی - یوں یہ نیشنلزم آدمی کے دماغ کو اسلام سے جاہلیت کی طرف پھیر دیتا ہے - گوک الپ ضیا، جو دراصل تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے ترکی جدید کا بانی ہے، اور جس کے بنائے ہوئے راستہ پر آج ترکی قوم چل رہی ہے، خالدہ ادیب خانم کے الفاظ ہیں:

"ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور انکے تورانی اسلاف کے درمیان کی خلیج کو پر کر سکے.... وہ اس مواد کی بنا پر تمدنی اصلاح کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے زمانۂ قبل اسلام کی سیاسی و تمدنی تنظیمات کے متعلق فراہم کیا تھا - اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہو سکتا - اگر ہم اپنے "عہد جاہلیت" کی طرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مناسبت رکھتی ہو۔"

یہ الفاظ کسی مغربی پروپیگنڈسٹ کے نہیں ہیں جو ترکوں کو بدنام کرنا چاہتا ہو، بلکہ خود ایک قوم پرست ترکن کے ہیں - ان میں آپ صاف طور پر یہ منظر دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمان کے دل و دماغ میں جب ایک راستہ سے قوم پرستی گھسنی شروع ہوتی ہے تو کس طرح دوسرے راستے سے اسلام نکلنے لگتا ہے - اور یہ چیز کچھ بیچارے ترکوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں - جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی ہے اسلام کے فرشتوں سے اس کا رخصتی مصافحہ ہو گیا ہے - ابھی حال میں ہندوستان کے ایک "مسلمان" شاعر نے

ترانۂ وطن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں وہ اپنی بھارت ماتا کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے :

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو
جسکے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو جس سے جنت سے بڑھ کر دنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دینگے ہم

آخری بیت کو پڑھ کر اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام، دو بالکل الگ اور قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہونا محالات سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کے جواب میں ایک حریف، مدمقابل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف ذہنی حیثیت سے شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے، بلکہ عملی حیثیت سے بھی انسان کی زندگی کے اُن تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے جنہیں شرائع الٰہیہ اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہیں[1]۔ اب ایک مرد عاقل کے لیے صرف یہی ایک صورت باقی ہے کہ دل و دماغ اور جسم و جان کا مطالبہ کرنے والے ان دونوں مدعیوں میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دے، اور جب ایک کی آغوش میں چلا جائے تو دوسرے کا نام تک نہ لے۔

---

[1] پروفیسر لیٹن کہتا ہے "نیشنلزم نے مذہب اور عقل و ضمیر دونوں کی جگہ چھین لی ہے۔ وہ انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر اسی طرح حاوی ہونا چاہتا ہے جس طرح کہ مذہب۔ آج جو شخص اُس خدا کے سامنے، جسکا نام قومی اسٹیٹ ہے، جھکنے اور اپنے ضمیر کو قربان کر کے اسکی عبادت بجالانے سے انکار کرتا ہے وہ شخص آزادی اور حقوق شہریت سے محروم کر دیا جاتا ہے"۔ ملاحظہ ہو :

Social Philosophies in Conflict p. 450.

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں آزادی اور ترقی اور وقار و شرف حاصل کرنے کا ایک ہی مجرب نسخہ دنیا کی قوموں کو معلوم ہے، اور وہ یہی نیشنلزم کا نسخہ ہے - اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر وہ قوم جو ابھرنا چاہتی ہے، اس نسخہ کی طرف دوڑنے لگتی ہے - مگر قبل اس کے کہ دوسروں کو دوڑتے دیکھ کر ہم بھی اسی کی طرف دوڑ جائیں، ہمیں سوچنا چاہیے کہ دنیا کی یہ حالت کیوں ہے - دنیا اس حالت میں صرف اس لیے مبتلا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی خواہشات کو ضابطہ میں لانے والی، حوصلوں اور تمناؤں کو جائز حدود میں رکھنے والی، سعی و عمل کی قوتوں کو سیدھا راستہ دکھانے والی، اور آزادی، ترقی، عزت اور وقار کے حصول کا صحیح طریقہ بتانے والی کوئی تعلیم حکمت و اخلاق دنیا کے پاس نہیں ہے - اسی چیز نے قوموں کو بھٹکا دیا ہے - یہی محرومی اور یہی نقدان ہے جس نے قوموں کو جاہلیت اور ظلم و عدوان کی طرف دھکیل دیا ہے - خود ہمارے اپنے ملک کے ہندو اور سکھ اور پارسی وغیرہ بھی جس وجہ سے مغرب کے قوم پرستانہ خیالات قبول کر رہے ہیں، وہ یہی ہے کہ یہ بے چارے اس ہدایت و رہنمائی سے محروم ہیں - اس مصیبت کا علاج اور اس گمراہی کی اصلاح اگر کہیں ہے تو وہ صرف شرائع الٰہیہ میں ہے، اور دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ جماعت ہے جو شرائع الٰہیہ کی نمائندگی کرتی ہے، لہٰذا یہ مسلمان کا کام تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس عصبیت جاہلیہ کی جڑیں کاٹتا جو آکاس بیل کی طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، اور دنیا کی ہر قوم کو بتاتا کہ تمہارے لیے نہ صرف آزادی، ترقی اور وقار و شرف کا بلکہ اس کے ساتھ سلامتی، امن اور حقیقی خوشحالی کا راستہ بھی وہ ہے جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر لائے ہیں، نہ کہ وہ جو شیطان کی طرف سے فتنہ و شر کے امام تمہیں دکھا رہے ہیں - لیکن یہ دور حاضر کی سب سے زیادہ دردناک ٹریجڈی ہے کہ دنیا کو تباہی اور گمراہی سے بچانے والی وہ ایک ہی جماعت، مسلمان جس کو اللہ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کا مشن قائم کرنے اور پھیلانے پر مامور کیا تھا، اپنے

فرض منصبی کو فراموش کر بیٹھی ہے، اور اب بجائے اس کے کہ وہ ہدایت کی شمع لیکر تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کو روشنی دکھلائے، وہ خود ان بھٹکنے والوں ہی کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو رہی ہے۔ افسوس، اس بیمارستان میں ایک ہی ڈاکٹر تھا، اور وہ بھی بیماروں میں شامل ہوا جاتا ہے

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے۔

(باقی)

مسئلۂ قومیت

تالیف سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے اصولِ قومیت کی تشریح و توضیح کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان نسلی یا وطنی قومیت کے اصول قبول نہیں کر سکتے۔ نہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر کوئی قومیت بنا سکتے ہیں۔

قیمت ۴ر محصول ڈاک ۱؍

دفتر ترجمان القرآن۔ مبارک پارک۔ لاہور سے طلب کیجیے

مطبوعات

پیامِ امین تالیف مولانا محمد عبداللہ صاحب منہاس سابق ایڈیٹر اخبار وکیل - ضخامت ۲۰۴ صفحات چھوٹی تقطیع - قیمت درج نہیں - ملنے کا پتہ: منیجر شرکت ادبیہ، شریف گنج، امرت سر۔

یہ کتاب قرآن کی صداقت اور عظمت و جلالت پر ایک بیش قیمت تصنیف ہے - مصنف نے غیر مسلم محققین اور منصف مزاج اہل نظر کے ان بے شمار اقوال کو یکجا کر دیا ہے جو قرآنی صداقت سے متاثر ہو کر ان کی زبان و قلم سے نکلے ہیں - گو قرآن اپنی صداقت میں کسی مغربی یا مشرقی مفکر کی تائید و شہادت کا قطعاً محتاج نہیں، وہ سورج کی طرح آپ ہی اپنی حقانیت کی دلیل ہے، مگر پھر بھی یہ اعترافات، جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے منہ سے اضطراراً نکلے ہیں، قرآن کی گہری اور بے پایاں سچائی اور بزرگی کا ایک مزید ایقان و اذعان پیدا کرتے ہیں - اس لحاظ سے فاضل مولف کی یہ کوشش نہایت ہی قابل قدر اور سعید کوشش ہے جسے نہ صرف مسلم حلقوں میں پہنچنا چاہیئے بلکہ غیر مسلم اور بالخصوص "مسلم نما غیر مسلم" حضرات کے ہاتھوں میں اسے دینا چاہیئے تاکہ انھیں معلوم ہو کہ یہ قرآن، جس کے متعلق انہوں نے مطالعہ کیے بغیر ایک متعصبانہ رائے قائم کر لی ہے، ان سنجیدہ اہلِ علم سے کس طرح خراج تحسین وصول کرتا ہے جنہوں نے اس کا کسی نہ کسی حد تک مطالعہ کیا ہے -

مصنف نے بڑی ہی کاوشوں سے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے - بقول خود انھیں اس کی ترتیب و تدوین میں مختلف زبانوں کی تقریباً تین سو کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے - شروع میں قرآن کی ترتیب و اشاعت پر ایک مختصر تاریخی تبصرہ ہے - اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کے

کن کن زبانوں میں، کب اور کتنے ترجمے اب تک ہو چکے ہیں۔ پھر ان تمام اقوال و آرا کو جمع کر دیا ہے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اگرچہ انھوں نے بیشتر مقامات پر اصل ماخذ کا حوالہ دیدیا ہے مگر اکثر اقوال بغیر حوالہ کے بھی ہیں حالانکہ اس کی شدید ضرورت تھی۔ اسی طرح کہیں کہیں کسی اقتباس کے درمیان میں بعض جملے ایسے آجاتے ہیں جو حقیقت کے خلاف اور قائل کی نافہمی یا اس کے تعصب کا نتیجہ ہیں۔ ضرورت تھی کہ حاشیہ میں اس کی تردید کر دی جاتی تاکہ ناواقف شخص کو دھوکہ نہ لگ جائے۔

جمع و ترتیب قرآن کے متعلق مولف کے نظریہ سے ہم متفق نہیں ہیں۔ قرآن کا جمع اور اسکی تدوین و ترتیب بھی اسی طرح توقیفی ہے جس طرح ایک سورہ کی آیتوں کی باہمی ترتیب۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ صرف ایک حصہ کی ترتیب و تدوین ہی آنحضرت صلعم کے حین حیات میں ہوئی تھی اور باقی کام بعد میں صحابہ کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ صحابہ کرام نے صرف اتنا کیا کہ قرآن کے متفرق و منتشر اجزا کو حسب ترتیب نبوی ایک جلد میں یکجا کر دیا۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ کی حجت بالغہ اس حقیقت کی شاہد عدل ہے۔

سیدالبشرؐ | تالیف مولوی ابوسعید عبدالرحمٰن صاحب فریدکوٹی۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۲ ر ملنے کا پتہ: میاں سعید احمد خانصاحب دروازہ نندیالی، فریدکوٹ اسٹیٹ (پنجاب)۔ دفتر ترجمان القرآن سے بھی مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں بائبل سے ایسی پچاس بشارتیں درج کی گئی ہیں جو نبی آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے متعلق انبیائے سابقین پر نازل ہوئی تھیں۔ ہرچند کہ حق کے معاند اور رسول اللہ کے حاسد اہل کتاب نے جوش تعصب میں ان تمام آیات کو اپنی کتابوں سے یا تو بالکل ہی نکال ڈالنے کی ناپاک کوشش کی یا کم از کم انھیں محرف کر ڈالا جن میں آنحضرت کی آمد کی کھلی نشانیاں اور غیر مبہم بشارتیں موجود تھیں۔ لیکن اس تمام کوشش کے باوجود وہ اپنے شیطانی مقاصد میں کامیاب نہ ہوئے

اور اب بھی صدہا آیات ایسی موجود ہیں جن میں صداقت کا نور چمک رہا ہے اور تمام اہل کتاب پر رسول موعود کی سچائی کے بارے میں اتمام حجت کر رہا ہے۔ فاضل مصنف نے انھیں آیات میں سے مختلف صحیفوں کی پچاس پیشین گوئیوں کو جمع کر دیا ہے، جن میں سے بعض تو بالکل صریح اور واضح ہیں اور بعض بانداز کنایہ و استعارہ کسی قدر مبہم ہیں۔ لیکن مصنف نے ہر پیشین گوئی نقل کرنے کے بعد اس پر مختصر تشریحی نوٹ لکھکر اس پردۂ ابہام کو بھی اٹھا دیا ہے۔ موصوف نے اس مجموعہ کو مرتب کرکے جو سعادت حاصل کی ہے وہ ہر طرح سے مبارک ہے۔ قرآن کے طالب علموں اور دینی مناظروں کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

مصنف کو انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کچھ تحریر کرتے وقت اپنے قلم کو کسی قدر اور محتاط رکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح بحیرا راہب کے واقعہ سے استناد کرنے سے بھی محترز رہنا چاہیے تھا۔ یہ واقعہ تاریخی تحقیقات کی کسوٹی پر کسی طرح صحیح نہیں ثابت ہوتا اور اس کو تسلیم کر لینے سے سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں کہ یورپ کے متعصب ائمہ جہل کو ذات قدسی صفات پر حملے کرنے کا ایک اوچھا ہتھیار مل جاتا ہے۔

سیرت سید احمد شہیدؒ | تالیف مولوی سید ابوالحسن علی صاحب ندوی۔ ضخامت ۴۴۴ صفحات قیمت مجلد عـ؎

ملنے کا پتہ: معین الدہر صاحب، کتابخانہ۔ محمد علی لین۔ لکھنؤ۔

یہ اس پاکباز انسان کے سوانح حیات ہیں جو بیک وقت فقیر بے نوا بھی تھا اور سلطان وقت بھی، خانقاہ کا کنج نشین بھی تھا اور میدان کا مرد غازی بھی، یعنی وہ جو ایک واقعی مرد مومن اور اس آخری دور میں اسلام کی صحیح تصویر تھا اور جسے دنیا نے مجدد اسلام اور امیر المومنین کے ناموں سے یاد کیا۔ مولف موصوف چونکہ خود اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے جو حالات اور واقعات انھیں میسر آسکے ہیں شاید دوسروں کی وہاں تک رسائی نہ ہوتی۔ چنانچہ کتاب کی جامعیت، اسکا انداز بیان اور طرز تالیف اس امر پر شاہد ہے کہ اس سے پہلے جو کتابیں سید صاحب کے حالات میں لکھی گئی ہیں انہیں اس سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس

کتاب میں سید صاحب مجددؒ کی سیرت، آپکے سوانح زندگی، آپکی تبلیغ و ہدایت، آپکی تنظیم ملی اور آپکے تمام مجاہدانہ معرکوں کا حال تفصیل سے اور دلنشین اسلوب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں آپکے مشہور خلفاء کے مختصر حالات بھی دیدیئے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ جب امام وقت اور علمبردار نور نبوت بالاکوٹ کے میدان میں، قضائے الٰہی کے دامنوں کے اندر روپوش ہوگیا تو اسکے فیض یافتہ سرفروشوں نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے۔

جو مسلمان "تلاش حق" اور "میری کہانی" میں فلاح و نجاح کی راہیں ڈھونڈھ رہے ہیں انھیں چاہیے کہ ایک نظر اس کتاب کا بھی مطالعہ کریں تاکہ انہیں اندازہ ہو کہ ایک مسلمان کی شان اور حیثیت کیا ہوتی ہے؟ وہ کس نگاہ سے دنیا کو دیکھتا اور کس دماغ سے مسائل کو سوچتا ہے؟ اسکی زندگی کا مشن کیا ہے؟ دنیا میں زندہ رہنے اور کفر سے لڑکر اسے مغلوب کرنیکا طریقہ کیا ہے؟ اور جو مسلمان دشمن کے سامنے اسلام یا جزیہ یا تلوار کے سوا تیسری چیز پیش کرنیکا خدا کی طرف سے قطعاً مجاز نہیں ہے، اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے جھگڑوں میں الجھنے کی کونسی گنجائش ہے؟

کتاب زیر تبصرہ میں مصنف نے اس حقیقت کو قوی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ سید صاحب کے جہاد کا مقصد صرف پنجاب ہی کے مسلمانوں کو سکھوں کے ناروا مظالم سے نجات دلانا نہ تھا بلکہ خدا کی زمین میں کفر کی بادشاہی کو مٹا کر اسلامی نظام حکومت اور خلافت الٰہی کا قیام تھا، اور آپ کے سامنے صرف سکھ ہی نہ تھے بلکہ انگریز بھی تھے، لیکن مقتضائے وقت کی بنا پر ابتداء سکھوں کے ساتھ کی گئی اور جنگ شروع کرنے سے پہلے صاف لفظوں میں آپ نے سکھ مہاراجہ کو لکھ بھیجا کہ (۱) یا تو اسلام قبول کرو (۲) یا اطاعت قبول کرکے جزیہ دو (۳) یا آخر میں لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن مسلمانوں کی یہ کیسی سخت بدنصیبی ہے کہ اب کفر کی شوکت سے مرعوب گروہ نہ صرف یہ کہ اسلامی حکومت کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں، بلکہ غیر مسلموں کی خوشامد میں اپنی تاریخ کو بھی بدل رہے ہیں اور انہیں یقین دلا رہے ہیں کہ حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کا جہاد حکومت شرعی قائم کرنے کیلیے نہ تھا۔ ابھی حال میں ایک بزرگوار نے کانگریس کی حمایت میں مذہب کو سیاست سے علیحدہ رکھنے کی تبلیغ میں ایک کتاب لکھی ہے اور اسکا نام رکھا ہے "مسلمانوں کا روشن مستقبل"۔ اس کتاب میں آپ نے بے تکلف لکھ مارا ہے کہ "مگر یہ (یعنی قیام حکومت) آپکے مشن کے خلاف تھا" اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دماغ سے شرعی حکومت قائم کرنیکا سودا نکال دینا چاہیے۔ افسوس ہے اس کتمان حقیقت پر اور اسلام سے مسلمانوں کے ایسے "روشن مستقبل" پر جس میں اسلام کی حکومت کا سودا ہی ان کے سر سے نکل جائے۔ یہ سودا نکلنے کے بعد مسلمان ہوگا کہاں کہ اس کا کوئی مستقبل ہو اور وہ روشن بھی ہو!

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اوّل

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصہ دوم

اس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مفصل تبصرہ کر کے بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصولِ اسلام اور مسلمانوں کے قومی مفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیئے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے:۔

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	محصول ڈاک
آٹھ آنے فی جلد	ایک روپیہ آٹھ آنے	ایک روپیہ چار آنے	تین آنے

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیاہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے

۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں

۴- اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

۵- قوانین جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

۶- جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔

۷- جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ۔ قیمت مجلد ۵؍ غیر مجلد ۴؍ للعہ

رسالہ دینیات یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا بہت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ جدید کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصولڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سروق وتصاویر پرنٹ پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئے